معارف

جنوری ۲۰۱۸ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۱ | ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۸ء | عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

علم و تحقیق کی دنیا میں اختلاف رائے ناگزیر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اصحاب علم اور اہل نظر علمی مسائل پر ایک ہی طرح سے سوچیں اور یکساں نتائج تک پہنچیں۔ وہ معاشرہ جس میں فکر و نظر کی آزادی نہ ہو، جہاں اختلاف رائے اور تنقید کی اجازت نہ ہو، جہاں سب لوگ ایک ہی رائے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوں، جہاں بحث و تحقیق کی سطح پر بھی اختلاف رائے کو بغاوت اور سوئے ادب سمجھا جائے وہاں علم کے فروغ کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور فکری جمود اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔ اختلاف رائے اور مخالفت، صحت مند تنقید اور تنقیص میں جو بنیادی فرق ہے اسے علم و دانش کی دنیا میں ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہماری تاریخ میں ابتدا ہی سے اختلاف رائے اور مثبت تنقید کا احترام کیا گیا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ تنقید صحت مند اور مثبت ہو اور اس کی اساس دلیل و برہان پر استوار ہو۔ دارالمصنّفین میں اس حق کو نہ صرف اصولی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ عملی طور پر اسے برتا بھی جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہم کو یہی تعلیم دی ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' کے جواب میں جب نظیر الحسن فوق کی کتاب ''المیزان'' شائع ہوئی تو علامہ شبلی نے ان کو ایک خط لکھ کر ان کی دبیر شناسی کی داد دی۔ اس خط میں انہوں نے کہا: ''آج مجھ کو موازنہ کی قدر ہوئی کیونکہ اس بہانے اردو میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا اور ایک باکمال کے جوہر اچھی طرح کھلے۔ آپ کی عنایت کا مشکور اور طرز تحریر کا مداح ہوں''۔ ہمارے بڑے مصنّفین کے سلسلہ میں اس طرح کی کتنی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اپنے استاد سے مولانا سید سلیمان ندوی کی عقیدت و محبت ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ استاد کے مشن کی تکمیل کے لیے انہوں نے جس طرح اپنی پوری زندگی وقف کر دی علمی دنیا میں اس کی مثال کم ہی مل سکتی ہے۔ اس عقیدت، محبت اور احترام کے باوجود انہوں نے استاد کی بہت سی رایوں اور تحقیقات سے اختلاف کیا۔ اس کے شواہد سیرت النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کے حواشی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دارالمصنّفین اسی اصولی موقف کا ابتدا ہی سے قائل رہا ہے اور اگر اس سے کبھی انحراف ہوا ہے تو وہ شخصی ترجیحات کا معاملہ رہا ہے، ادارہ کی پالیسی کا نہیں۔

فکر و نظر کی اسی آزادی کے زیر اثر دارالمصنّفین کے سابق ناظم اور مشہور مصنف اور اہل قلم مولانا ضیاءالدین اصلاحی صاحب نے حیات مستعار کے آخری دنوں میں مرزا دبیر کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب لکھی اور اب دارالمصنّفین سے اس کی اشاعت کا منصوبہ ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' کے مصنف کے قائم کیے ہوئے اس ادارے کے علاوہ کیا کسی اور ادارے میں اس کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ شبلی صدی کی مناسبت سے دارالمصنّفین کو جو نہایت اعلیٰ درجہ کی کتابوں کی اشاعت کی توفیق نصیب ہوئی ان میں ایک نہایت وقیع اور اہم

کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' شامل ہے۔ یہ علامہ شبلی کے ہم عصر اہل قلم اور دانشوروں کی ان نگارشات کا مجموعہ ہے جن میں انہوں نے علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار و خدمات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس میں مداحانہ تحریریں بھی شامل ہیں اور ناقدانہ بھی۔ کہیں مدح میں مبالغہ کا عنصر در آیا ہے تو کہیں تنقید کا لہجہ تند ہو گیا ہے۔ جب معاملہ علامہ شبلی جیسی کثیر الجہات شخصیت کا ہو جس کی دینی، ملی اور علمی خدمات میں اتنا غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہو تو اس کے مطالعہ اور تجزیہ میں بھی تنوع ناگزیر بھی ہے اور فطری بھی۔ اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ اختلاف رائے کی اس روایت کے مزید استحکام کے مقصد سے دارالمصنّفین میں مولانا حالی صدی منانے کا اہتمام کیا گیا۔ ہمیں خوشی ہے کہ جس طرح مولانا حالی کو دارالمصنّفین میں یاد کیا گیا اس طرح کہیں اور یاد نہیں کیا گیا۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر ایک سیمینار کے انعقاد کے علاوہ ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''حیات سعدی'' کے محقق ایڈیشن کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کا ایک وقیع مجموعہ ''مولانا حالی کی یاد میں'' شائع ہو چکا ہے۔ اسی جذبہ کے زیر اثر ابھی چند ہفتوں پہلے سرسید کے دو صد سالہ جشن ولادت کی مناسبت سے ''سرسید کی عصری معنویت'' کے موضوع پر دارالمصنّفین میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ انشاءاللہ اس سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات کو جلد شائع کیا جائے گا۔ اس موقع پر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے والے سرسید کے اداریوں کے ایک باوقار اور خوبصورت مجوعہ ''شذرات سرسید'' کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا گیا۔ آنے والے دنوں میں ''شبلی کی آپ بیتی'' کے طرز پر ''سرسید کی سرگزشت'' شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ ''شبلی کی آپ بیتی'' کے مرتب ڈاکٹر خالد ندیم صاحب نے اس سلسلہ میں ہماری درخواست قبول کر لی ہے۔

سرسید، مولانا حالی اور علامہ شبلی کے درمیان اختلافات بلکہ مخالفت کا جو بیانیہ گذشتہ سو سال کے عرصہ میں نہایت محنت اور کوشش سے تیار کیا گیا ہے اہل نظر اس سے بخوبی واقف ہیں۔ شبلی شکنی کے مقصد سے جو حد درجہ دل آزار اور انتہائی تکلیف دہ لٹریچر بڑی کاوش اور دلچسپی سے معرض وجود میں آیا ہے اہل علم اس سے بھی آگاہ ہیں۔ کن کن لوگوں نے اس میں حصہ لیا اور اس کو آگے بڑھایا ان کے نام اور کام بھی اہل دانش سے پوشیدہ نہیں۔ اس پس منظر میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کام کتنا مشکل تھا اور اس خلیج کو پاٹنا کتنا دشوار تھا۔ توفیق ایزدی سے دارالمصنّفین نے اس مشکل مرحلہ کو سر کیا اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دارالمصنّفین کی یہ کوشش ہے کہ ماضی کی یہ تلخیاں ختم ہوں اور اختلاف رائے کے بنیادی حق کا احترام کرتے ہوئے ان تمام بزرگوں کو وہ مقام و مرتبہ دیا جائے جس کے وہ اپنی عظیم الشان خدمات کی وجہ سے مستحق ہیں۔ یہ ہماری قابل فخر مشترکہ وراثت کا حصہ ہے۔

اس پس منظر میں جب ہمارے مخدوم اور محترم بزرگ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی صاحب نے، جن کی نسبتیں دارالمصنّفین سے گوناگوں ہیں، ''فکر نو'' کے دسمبر کے شمارے میں اپنے دردمندانہ اداریہ میں دارالمصنّفین کے

بارے میں یہ لکھا کہ ''کیا دارالمصنّفین، اعظم گڑھ میں کوئی علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی کسی خامی یا کوتاہی کے ذکر کی گستاخی کرسکتا ہے۔ہم دوسروں سے معلوم نہیں کیا کیا توقعات رکھتے ہیں، خود کتنا حق انصاف پسندی ادا کرتے ہیں'' تو سخت حیرت بھی ہوئی اور شدید دکھ کا احساس بھی۔ ہم نہایت ادب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس میں دارالمصنّفین کی حقیقی صورتِ حال کی عکاسی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ دارالمصنّفین نے کبھی دوسروں سے تو کوئی توقع نہیں وابستہ کی البتہ ممکن حد تک حق انصاف پسندی ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ ہر مذہب، ہر مسلک اور ہر فکر کے لوگوں کے لیے اس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں اور معارف کے ایک لاکھ سے زیادہ صفحات میں اس کے شواہد بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم دوسرے اداروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن دارالمصنّفین میں خامی یا کوتاہی کے ذکر کو گستاخی پر محمول نہیں کیا جاتا۔ بے عیب ذات صرف اللہ کی ہے اور معصوم عن الخطا ہونے کا شرف صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے۔ علامہ شبلی، مولانا حمیدالدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی اور دارالمصنّفین کے دوسرے اساطین سے ہم کو عقیدت بھی ہے اور محبت بھی۔ ان کی قربانیاں، خدمات اور کارنامے ایسے ہیں کہ ان سے محبت کی جائے۔ لیکن عقیدت اور محبت فرض کی ادائیگی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ معارف کے دسمبر ہی کے شمارے میں ''شبلی کا رسالہ سیرت'' کے عنوان سے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی صاحب کے مقالہ کی تیسری اور آخری قسط شائع ہوئی جو علامہ شبلی کے سیرت پاک پر عربی رسالہ ''بدء الاسلام'' کے فارسی اور اردو ترجمہ کا تنقیدی مطالعہ ہے اور تنقید کا لب ولہجہ بھی کئی بار خاصا سخت ہوگیا ہے۔ علامہ شبلی کا رسالہ ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل نصاب تھا۔ اس کا فارسی ترجمہ بھی کالج سے اسی دوران ۱۸۸۹ء میں شائع ہوا اور نصاب میں داخل رہا۔ یہ ترجمہ مولانا حمیدالدین فراہی نے کیا تھا جن کا ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اس ترجمہ کی اشاعت کے دو سال بعد ۱۸۹۱ء میں انہوں نے کالج میں انٹرنس میں داخلہ لیا۔ مولانا فراہی علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی اور عزیز شاگرد ہی نہیں تھے بلکہ دارالمصنّفین کے بنیاد گذاروں میں ان کو سرپرست کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ان سے عقیدت، محبت اور احترام کے جذبات اس مقالہ کی اشاعت کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ اس سے ایک مہینہ پہلے نومبر کے معارف میں جناب زبیر عالم کا مضمون ''قصہ حیات جاوید۔ مکتوبات حالی کی روشنی میں'' شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے معاصرین کی طرف سے حیات جاوید کے سلسلہ میں سرد مہری اور عدم دلچسپی کا سبب اس کتاب کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی آرا کو قرار دیا ہے۔ یہ مضمون بھی معارف میں شائع ہوا اور دارالمصنّفین میں کوئی اس پر چیں بجبیں نہ ہوا۔ یہ تو دو تازہ مثالیں ہیں ورنہ معارف میں اس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس پورے منظرنامہ میں جس کا ذکر ہمارے مخدوم گرامی قدر نے بڑے کرب کے ساتھ کیا ہے دارالمصنّفین کو ایک اہم استثناء کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔

مقالات

انصار کی ہجرت

جناب محمد طارق غازی

مہاجرین وانصار اولین مسلمانوں کی دو ممتاز جماعتیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود مہاجرین وانصار کو یہ القاب عطا کیے تھے اور پہلے دن سے آج تک یہ دونوں جماعتیں اپنے انہی امتیازی القاب سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ بعد میں لوگوں نے اپنے سماجی گروہوں کے لیے ان میں سے کوئی ایک لقب پیشہ ورانہ یا لسانی امتیاز کی خاطر استعمال کرنا شروع کیا مگر وہ تقدس کسی کو حاصل نہ ہوا جو قیامت تک کے لیے اسلام کے ان ابتدائی شیدائیوں اور فدائیوں کا مقدر بن گیا۔ ان دو جماعتوں کے یہ القاب اگرچہ مکہ اور مدینہ کے مسلمانوں کی امتیازی پہچان تھے لیکن ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ یہ القاب باہم دونوں جماعتوں پر یکساں صادق آتے تھے۔ مہاجرین بلا شبہ انصار بھی تھے کہ اسلام کے سب سے پہلے مددگار اور نصرت کرنے والے تو وہی تھے۔ ان بزرگوں کی نصرت واعانت کے بغیر تو اسلام یثرب تک بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی طرح انصار نے بھی ہجرت کی تھی۔ مہاجرین نے ہجرت کی تو اپنا وطن، عزیز واقارب اور گھر بار ہی نہیں چھوڑا، بلکہ اپنے مال اور املاک سے بھی ہجرت کی تھی۔ ان کی مانند انصار نے بھی مواخات کے تحت اپنے مال اور اپنی املاک مہاجرین کی خاطر چھوڑ دیں۔ یہ بھی ہجرت ہی کی مثالیں تھیں۔

ہجرت بہت عظیم ادارہ ہے۔ اس کا ایک معنی تو وہ ہے جو عام فہم ہے کہ اللہ کے راستے میں اذیت کے مقام سے راحت کے مقام کی طرف کوچ کرنا۔ یہ صورت تو فتح مکہ کے بعد ختم ہوگئی، اگرچہ ہر دور میں کسی بھی مقام پر کوئی ایسی تکلیف دہ صورت پیدا ہو تو اس سنت پر عمل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ نیت اللہ کے دین کی سرفرازی ہو۔ اور ایک تعریف رسول اللہؐ نے متعین فرمائی جو قیامت تک امت کے لیے نیکی کا راستہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا مہاجر وہ ہے جو

ڈائریکٹر امم اسٹڈیز ہاؤس/ ٹورانٹو، کینیڈا۔

ایسی تمام چیزوں سے رک جائے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔(۱)

مہاجرین وانصار کے مابین مواخات، بھائی بندی، انسانی تاریخ میں اس نوعیت کا نیا تجربہ تھا۔اس نظام میں مہاجر وانصار افراد کو یوں باہم مربوط اور شیر وشکر کر دیا گیا تھا جیسے وہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں۔ بھائی بندی کسی پر تھوپی نہیں گئی تھی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی ایک انصاری نے بھی اس نظام کی مخالفت کی نہ اس پر کوئی اعتراض کیا۔اس کے برخلاف مہاجرین کی مدد ونصرت کے لیے ان سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں انہوں نے ان سے زیادہ کر کے دکھا دیا۔ بعد میں آج تک خود مسلمان بھی اس عمل کو اپنا عمرانی شعار اور معاشرتی روایت نہ بنا سکے۔اور اس لیے نہ بنا سکے کہ ایسے کام انتہا درجہ کی قربانی اور خود کو فراموش کر کے مدد واعانت کے بے مثال جذبہ کے بغیر نہیں ہوا کرتے۔ کہہ سکتے ہیں کہ قربانی کا وہ جذبہ بس اسی قوم کی اسی نسل کے لیے قدرت نے خاص کیا تھا۔

صبر وعزیمت کی آزمائش: جب مہاجرین مدینہ پہنچے وہ خالی ہاتھ تھے۔مگر وہ ہمیشہ کے ایسے نہ تھے۔ ان میں اکثر اپنے مال میں سے ایک حبہ بھی نہیں لا سکے تھے۔ اسلام سے پہلے مکہ میں وہ کامیاب تاجر،صنعت کار، ہنر پیشہ،اور اہل حرفہ تھے۔مگر اسلام قبول کرنے کے بعد مشرکین نے ان زندگی اجیرن کردی تھی، جبراً ان کی تجارتیں اور کارخانے بند کر دیے تھے، ان کے روزگار کے مواقع مسدود کر دیے تھے، ان کے صنعت گھر اور کارگاہیں برباد کر دیں تھیں۔ مکہ میں مسلمان اہل ہنر کے واسطے کوئی کام باقی نہ رہا تھا۔ کفار ان سے نہ کام لیتے تھے نہ انہیں کوئی کام دیتے تھے۔ اہل حرفہ بے روزگار ہو گئے تھے کیونکہ بازار میں ان کے بنائے ہوئے سامان کا کوئی خریدار نہ ہوتا تھا۔ یہ سب مشرکین قریش کی نفرتوں اور انتقامی جذبہ کا اندوہناک حاصل تھا جس کے تباہ کن اثرات خود مشرکین کو جلد ہی بھگتنے پڑے تھے۔مگر یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ یہ حقیقت کے انکار کی کیفیت تھی۔ اور حقیقت کا انکار کرنے والے جلد یا بہ دیر دنیا میں مایوسی کی کھیتی کاٹتے آئے ہیں۔

تاہم مکہ کے اولین مسلمان وہ بہادر انسان تھے جنہوں نے اپنے مال اور اپنی جانوں سے رسول اللہ ﷺ کی حمایت کی اور اسلام کی راہ میں پیش آنے والی ہر مشکل اور دشواری کو شکوہ شکایت کے بغیر انگیز کیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ آزمائش کی گھڑیوں میں کبھی کبھی سورماؤں کے قدم بھی اکھڑ جاتے ہیں۔مگر یہ قصہ ان کا ہے جن سے سورما بہادری کا سبق لیتے ہیں۔انہی بزرگوں کی ان قربانیوں اور نصرت

کے نتیجہ میں اسلام آخر جزیرۃ العرب کے چپہ چپہ پر اور پھر ساری مہذب دنیا میں پھیل سکا۔ اس لیے ان بزرگوں کو اہل مدینہ کی مانند انصار کہا جائے تو درست ہے۔

ان بہادر مہاجرین کی مالداری اور جبری ناداری کی بہت سی کہانیاں ہیں۔ ان میں سے چند کا آموختہ ان حالات کی ترجمانی کرے گا جن سے یہ حضرات اسلام لانے کے بعد دوچار ہوئے۔

مہاجرین کے معاشی حالات: حضرت ابوبکر الصدیقؓ قریش کی شاخ بنی تیم کے ایک مرفہ الحال تاجر تھے۔ ریاست مکہ میں وہ عدل اور عرب بین القبائل تعلقات کے وزیر تھے، مگر اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے سیاسی اور معاشی حقوق سلب کر لیے گئے تھے اور ان کا جینا دوبھر کر دیا گیا تھا، یہاں تک ایک روز یمن یا حبشہ کی ہجرت کے ارادہ سے انہوں نے تن تنہا شہر چھوڑ دیا۔ مکہ سے باہر برک الغماد کے مقام پر ان کی ملاقات بنی قارہ کے سردار مالک ابن دغنہ سے ہوئی۔ ابن دغنہ نے ان جیسے شخص کے شہر چھوڑنے کو برا سمجھا اور اپنی ذاتی پناہ میں لے کر مکہ واپس لایا۔ اگرچہ یہ پناہ دیرپا ثابت نہ ہوئی لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکرؓ پہلے کی طرح دوبارہ اپنا آزادانہ کاروبار شروع نہ کرسکے۔ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تھا تو ان کا نقد مالیہ چالیس ہزار درہم تھا جس کا کثیر حصہ انہوں نے تقریباً ایک درجن مسلم غلاموں اور کنیزوں کو خرید کر آزاد کرنے پر صرف کردیا تھا۔ تیرہ سال بعد ہجرت کے موقعہ پر ان کی بچت صرف پانچ ہزار درہم رہ گئی تھی جسے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔(۲)

حضرت ابوسلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد کا تعلق قریش کے بااثر قبیلہ مخزوم سے تھا۔ ننھیالی رشتہ سے رسول اللہؐ کے پھوپی زاد بھائی، برہ بنت عبدالمطلب کے بطن سے تھے۔ وہ اچھے خاصے دولت مند آدمی تھے، مگر اسلام قبول کرنے کی پاداش میں اپنے مال سے محروم کردیے گئے۔ حالات سے مجبور ہوکر رسول اللہؐ کی اجازت سے وہ اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ کے ساتھ ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے۔ مگر جلد ہی اس خیال سے واپس آگئے کہ دشمنوں کے نرغہ میں رسول اللہؐ تنہا ہیں۔ جب انہیں ہجرت کرکے مدینہ جانے کی اجازت ملی تو وہ حضرت ام سلمہؓ اور اپنے بیٹے حضرت سلمہؓ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ مگر شہر کی سرحد پر کفار نے انہیں گھیر لیا۔ حضرت ام سلمہؓ کے خاندان والوں نے انہیں اپنے شوہر کے ساتھ مدینہ جانے کی اجازت نہ دی اور حضرت ابوسلمہؓ کے خاندان والے ان کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف حضرت ابوسلمہؓ کو تنہا سفر کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ ناچار ہوکر انہوں نے تن تنہا سفر کا فیصلہ کیا۔ ان

کے پاس کچھ قابل ذکر زادراہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیل کر وہ مدینہ پہنچ سکے۔ کافی مدت بعد حضرت ام سلمہؓ کو اپنے بیٹا واپس ملا اور سخت تکلیفیں اٹھا کر سال بھر بعد وہ ہجرت کر سکیں۔(۳)

دین کی خاطر دنیا کا سودا: بنی جحش ابن رِئَاب کے بہت سے افراد ابتدا ہی میں ایمان لے آئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی پہلے حبشہ کی ہجرت کی اور بعد میں مدینہ پہنچے۔ ان مسلمانوں کو اپنے مکانات اور جائدادیں فروخت کرنے کی اجازت نہ ملی۔ ایک عرصہ تک وہ عمارتیں خالی پڑی رہیں۔ بعد میں ابوطالب کے جانشین رئیس مکہ ابوسفیان ابن حرب نے ان املاک کو فروخت کر کے رقم کو مدینہ کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں لگا دیا تھا۔ حضرت عبداللہؓ ابن جحش کو اپنے ہی مال کا ایک درہم بھی نہ ملا۔(۴)

حضرت مصعبؓ ابن عمیر بہت امیر والدین کے بیٹے تھے۔ ان کا تعلق قریش کے نہایت طاقتور قبیلہ عبدالدار ابن قصیٔ سے تھا۔ اسلام قبول کرتے ہی ان کی مالی حالت ایک دم پہاڑ سے نیچے اتر آئی۔ وہ شہر بھر میں اپنی خوش پوشاکی، خوشبو پسندی اور نفاست طبع کے لیے مشہور تھے اب غریب الغرباء تھے۔ فقر ان کی طبیعت میں رچ گیا تھا اور نفیس لباس کی جگہ موٹے اور سادہ کپڑے ان کے بدن کی زینت تھے، یہاں تک کہ جب غزوۂ احد میں شہید ہوئے تو کفن کے لیے اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ پورا بدن ڈھک جائے۔ سر ڈھکتے تو پیر کھل جاتے اور پیروں پر کپڑا ڈالتے تو سر کھلا رہ جاتا۔ تو چادر سے سر ڈھک دیا گیا اور پیروں کو اذخر گھاس سے چھپایا گیا۔ ان کے خاندان کی ثروت مندی کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنگ بدر میں ان کا بھائی ابوعزیز ابن عمیر کفار کے جنگی قیدیوں میں تھا اور اس کی رہائی کے لیے ماں نے ۴۰۰۰ درہم فدیہ کی رقم بھیجی تھی۔(۵)

حضرت صہیبؓ ابن سنان رومی ایک رومی غلام تھے اور نیم آزاد حالت میں مکہ میں رہتے تھے۔ ان کی اپنی ایک چھوٹی سے تجارت تھی۔ وہ نہ تو دولت مندوں میں شمار ہوتے تھے اور نہ ہی غریب تھے۔ مگر مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے عام رویہ کے مطابق ان کا کاروبار بھی بری طرح متاثر ہوا۔ روزمرہ گاہک میسر نہ آئیں تو چھوٹی تجارت نہیں چل سکتی۔ بعض مقامات پر معاندین آج بھی چھوٹے اور متوسط تاجروں کے خلاف یہ حربہ استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ حضرت صہیب کا کاروبار بھی اسی وجہ سے خسارہ دکھانے لگا۔ ان کی آمدنی سادہ گزر بسر کے لیے کافی نہ رہی تو انہوں نے مدینہ ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ غیر منقولہ جائداد کا تو کوئی خریدار بھی نہ تھا کہ اونے پونے ہی نکال دیں۔ انہوں نے اپنا

اثاث البیت اور نقدی اٹھائی اور روانگی کا قصد کیا۔ جیسے ہی ان کی روانگی کی خبر پھیلی مشرک شریروں نے انہیں گھیر لیا اور ان کی نقدی اور سامان کا مطالبہ کیا۔ ان شرپسندوں کا کہنا تھا کہ وہ خالی ہاتھ مکہ آئے تھے اور وہ سارا مال انہوں نے مکہ ہی میں بنایا تھا۔ اس لیے وہ مال ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ حضرت صہیب نے ان سے پوچھا کہ اگر وہ اپنا مال اسباب سب ان کے حوالہ کردیں تو ان کے شہر چھوڑنے پر تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شرپسندوں کو تو مال سے مطلب تھا۔ چنانچہ حضرت صہیبؓ نے سارا مال اسباب اور زرونقد مشرکوں کے حوالہ کیا اور یوں ہجرت کی کہ بدن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس زادراہ تک نہ تھا۔ اس حالت میں مدینہ پہنچے اور رسول اللہؐ سے ملے تو آپؐ نے فرمایا، ''صہیب نے عمدہ سودا کیا''۔(۶)

اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ایک حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ قریش کی شاخ بنی زہرہ کے ایک متمول تاجر تھے۔ ان کے والد عوف ابن عبدعوف خود بہت بڑے تاجر تھے اور مکہ کے انتہائی مالدار لوگوں میں سے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن کی تجارتی سوجھ بوجھ کا یہ عالم تھا کہ جس پتھر کو اٹھاتے تو امید کرتے کہ اس کے نیچے سونا یا چاندی ملے گی۔ حقیقت یہی ہے کہ مٹی اٹھاتے اور وہ سونا بن جاتی۔ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو جیب میں ایک درہم بھی نہیں تھا۔

ان جیسے ہزاروں دوسرے مہاجرین کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن مشرکین کا عام ناداری پھیلانے کا ہتھیار ناکام ہوگیا۔ مدینہ پہنچ کر محنت اور ایمان داری کی بنا پر یہ سارے نادار پھر مالدار ہوگئے اور دنیا نے وہ وقت بھی دیکھا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے کاروان تجارت میں ایک ایک وقت میں سات سو اونٹوں کی قطار چلتی تھی۔ ابن سعد نے ایک قافلہ کے اونٹوں کی تعداد ۵۰۰ بیان کی ہے۔(۷)

حضرت مرثد ابن ابی مرثد ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں اپنی صنعت گاہ میں مُہند نامی تلوار بناتے تھے اور غالباً اس قسم کی تلوار کے عرب موجد وہی تھے جو لوہے میں مختلف دھاتوں کی آمیزش سے بنائی جاتی تھی، اس طرح تلوار کی کاٹ عمدہ ہوجاتی اور نہ اس میں زنگ لگتا نہ کھنڈی ہوتی۔ ان کی بنائی ہوئی تلواریں جنگجو عرب قبائل میں پسند کی جاتی تھیں(۸)۔ ان کا کارخانہ بند کردیا گیا اور وہ ناداری کے عالم میں صرف اپنا فن اور ہنر لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔

نشانہ فقط اسلام تھا: متذکرہ بالا واقعات مکہ کے مسلمانوں کی مالی مشکلات کی چند مثالیں ہیں

کہ محض توحید کو اختیار کرنے پر ان حضرات کو ان کے اپنے مال اور جائداد تک سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ نکتہ خصوصاً قابل غور ہے کہ اسلام سے پہلے مکہ میں کچھ لوگوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ ایسے چند لوگوں میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی کے علاوہ عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو مشہور ہیں، یہاں تک کہ وہ انجیل کی تبلیغ و تعلیم کرتے تھے۔ زید کو ان کے چچا خطاب نے صرف شہر بدر کرنا ہی کافی سمجھا تھا۔ یمن اور شام میں عیسائیوں کی بڑی آبادیاں تھیں۔ یثرب، خیبر، وادی القریٰ، تیما، فدک وغیرہ میں یہودی قبائل بستے تھے اور ان کا دین عرب مشرکین کے عقیدوں کے خلاف تھا۔

ان سب سے مشرکین مکہ کی موالات تھی اور صرف عقیدہ کی بنیاد پر ان کے خلاف کسی معمولی نزاع کی بھی کوئی روایت تاریخ اور ایام عرب میں نہیں ملتی۔ خود سارے مشرکین بھی کسی ایک ہی بت کے پجاری نہیں تھے اور ان میں بہت اعتقادی اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر مشرکین کے ان اعتقادی گروہوں یا دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں کسی ایک شخص کو بھی نہ تو یوں جسمانی ایذائیں دی گئیں، نہ اس طرح اسباب زندگی ان سے چھینے گئے، نہ ان پر یوں زندگی اجیرن کی گئی جیسی مسلمانوں کا حصہ بنائی گئی تھی۔ اعتقادی نفرت، جسمانی ایذا رسانی اور تشدد، معاشرتی اور معاشی مقاطعہ، آمدنی کے وسائل پر روک، املاک پر غاصبانہ قبضہ اور ان املاک کی آمدنیوں کا مسلمانوں کے خلاف جنگی مصارف میں استعمال وغیرہ سب چیزوں کا نشانہ صرف اسلام تھا اور اس رویہ کے شکار صرف مسلمان تھے۔ عناد و فساد کی یہ کیفیت اس وقت پیدا نہ ہوئی جب سینکڑوں کی تعداد میں یہودی عرب قریوں میں آباد ہوئے۔ یہ حالت اس وقت رونما نہ ہوئی جب تبع حسان بن تبان ابوکرب کے ساتھ جانے والے دو یہودی احبار نے یمن میں دین موسوی کو رائج کیا تھا۔ یہ اعتراض اس وقت وارد نہیں ہوا تھا جب آل سبا کے اہل یمن شام پہنچ کر بیزنطینی غلبہ میں آکر عیسائی بن گئے تھے۔ یہ احتجاج اس وقت نہیں ہوا تھا جب عمرو بن لحیٔ خزاعی نے کعبہ کے اندر اور اس کے اطراف شام سے لاکر رومی اور یونانی بت بٹھائے تھے۔

عرب جاہلیہ میں یہ سب کچھ یوں نہ ہوا کہ ان سب فرقوں، عقیدوں اور مذہبوں سے شیطان کو کوئی اندیشہ نہ تھا۔

عقاید کی ان آندھیوں نے حالات کے تالابوں میں کوئی لہر تک پیدا نہ کی۔ لیکن جوں ہی

رسول اللہؐ نے ربانی حکم کے مطابق اپنے قریبی رشتہ داروں کے سامنے توحید کا کلمہ پیش کیا تو اور تو اور خود آپؐ کا چچا ابولہب ہی برہم ہوگیا، اول فول بکنے لگا اور دھمکیاں دینی شروع کردی (۹)۔ پھر اس کے بعد جو طوفان اٹھا ہے تو سارا حجاز ونجد، تہامہ ویمامہ اس کی زد میں آیا اور ہر مسلمان خواہ معاشرتی اور معاشی طور پر اس کا رتبہ کچھ بھی ہو ظلم وتعدی کی چکی میں پسا، یہاں تک کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر بھی وہ وہ حملے ہوئے کہ مکہ وطائف سے احد تک گزرتے ہوئے بدن لہولہان ہوگیا اور رسول اللہؐ کے جاں نثار پکار اٹھے

ہم اک دن وادیٔ طائف سے گزرے   تو اس دن سے نگہ میں آبلے ہیں

ہجرت کا مفہوم اور مقصود: کفار ومشرکین کے ارباب اقتدار کا جورویہ ۱۴۰۰ر سال پہلے تھا آج بھی اس میں سرمو فرق نہیں آیا۔ تاریخ کا یہ پہلو آج کے مسلم علماء اور مسلم خواص وعوام سب ہی کو اجتماعی احتساب کی دعوت دیتا ہے اور مثال میں مدینہ منورہ میں رسول اللہؐ کی قیادت اور مہاجرین و انصار کے ہم آہنگ اقدامات کا شعوری آموختہ کرنے پر اکساتا ہے۔

وہ لوگ جو ۱۳ر سال تک مشرکین کے بدترین ظلم وجور کو پوری استقامت کے ساتھ برداشت کررہے تھے بزدل اور دون ہمت نہیں تھے کہ ظالموں سے ڈر کر فرار ہوجاتے۔ ہجرت کے مادی اسباب سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا مگر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عمار بن یاسرؓ، حضرت بلال بن رباحؓ، حضرت مرثد بن ابی مرثدؓ جیسے بزرگوں کو غربت ونا داری کے خوف یا ہولناک اذیتوں کے ڈر نے اپنا شہر چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔

اس پس منظر میں ہجرت کا مفہوم بلکہ مقصود کھل کر سامنے آتا ہے۔ مسلمانان مکہ کی ہجرت فرار نہیں بلکہ ظلمت کی منفی طاقتوں کے مقابل ایک مثبت اور ایجابی نظام کے قیام کی جدوجہد کا ایک یقینی مرحلہ تھی۔ اس نظام کا قیام ہی منفی طاقتوں کی شکست فاش تھا، جس نقل وطن کا یہ نتیجہ نہ نکلے اسے اسلامی عمرانی اصطلاح میں ہجرت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ نقل وطن نسبتاً کمتر مقاصد حیات کے گرد گھومتی ہے۔ بقول افتخار عارف

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر   سگ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

ہجرت میں مساوات کا نکتہ: مسلمانان مکہ کی ہجرتوں کے جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ہیں وہ عجیب وغریب قربانیوں کے مرقعے ہیں۔ مادی راحتوں کی وہ انفرادی قربانیاں ایک معاشرتی عملیہ میں مستقبل قریب کے ممکنہ اجتماعی بلکہ عالمی انسانی مفادات کی خاطر دی گئی تھیں۔ ان کے پیچھے ذاتی مفادات اور انفرادی جلب منفعت اور کسب مال نہیں تھے۔ یہ تو تہذیب سازی کا وہ کھیل ہے جو معاشروں کے افادی امکانات سے اہل بصیرت کھیلتے ہیں۔ یہی انصار مدینہ کی ہجرت کا نقطۂ تکوین تھا۔

اللہ کے راستہ میں فلاح دارین کا سفر کرنے والے مہاجرین نے اپنے دنیوی وسائل اور املاک اور راحتوں کو ترک کیا تھا۔ بالکل اسی طرح انصار نے بھی اپنے مال اور املاک کی قربانی دی تھی صرف اس لیے نہیں کہ مہاجرین کی باز آباد کاری ہو جائے، بلکہ اس لیے کہ جن عظیم مقاصد کی خاطر وہ شریف انسان مکہ میں اپنے گھروں سے بے گھر اور اپنی مادی املاک سے محروم ہوئے تھے ان کی تکمیل میں ان بزرگوں کو مدینہ میں کسی مادی اور مالی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ انصار کا یہ عمل کفر وایمان کا فرق واضح کرتا تھا۔ لہٰذا ہجرت کا اعزاز اسلام کی ان دونوں اولین جماعتوں کو یکساں طور پر حاصل ہوا تھا۔ مواخات اس برابری اور برادری کا عملی نمونہ تھی۔ وہ انسانی تاریخ میں پہلا ایسا تجربہ تھا۔ دنیا میں کسی اور قوم نے ایثار وقربانی کا وہ مظاہرہ نہیں کیا جو انصار نے کر دکھایا۔

کرتا ہے کون اس طرح ایثار صاحبو دنیا میں کام کر گئے انصار صاحبو

اس عہد کے وہ مسلمان جو حالات سے خوفزدہ یا بدمزہ ہو کر فقط دولت کمانے کی خاطر گھروں سے نکل بھاگنے کو ہجرت کا نام دینے کی ارادی خطا میں مبتلا ہیں ان کے واسطے اسلامی ہجرت کا دروازہ کھلا ہے اور ایسے ہجرت کرنے والوں کی خاطر ایثار کرنے کی روایت بھی موجود ہے۔ انسانی زندگی میں جب بھی ایسی دو قوتیں یکجا ہوں گی دنیا میں انقلاب آ کر رہے گا۔ دنیا میں بھیجے جانے والے ہر نبی کی سنت ہجرت رہی ہے۔ اس ہجرت کو رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحاب نے جو مرتبہ عطا کر دیا وہ نزول عذاب کے بعد سکون اور یکسوئی کی زندگی نہیں، بلکہ دنیا سے عذاب کو ٹالے رکھنے کی ایک مستقل جد وجہد کا نام ہجرت ہے۔ اسی لیے دنیا کی تمام عذاب پسند اقوام اسلام کی مخالفت میں یک زبان ہیں۔ تاریخ ان اقوام کے لیے کتابوں میں درج ماضی گزینی کے سوا کچھ نہیں، لیکن بیدار ہوں تو مسلمانوں کے واسطے وہ کوچ کا نقارہ ہے۔

عام دربدری کی تاریخ: عام دربدری انسانی سرشت کا عجوبہ ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانوں کے متعدد گروہ نقل وطن پر مجبور ہوتے رہے ہیں۔ قحط، خشک سالی، طوفان، سیلاب، زلزلے، ارضی انہدام، زمین کا دھنسنا جیسی قدرتی آفات کے علاوہ جنگیں، قتل عام، نسل کشی، اقتصادی ناکہ بندی اور سماجی مقاطعہ جیسی انسانوں کی لائی ہوئی مصیبتیں ایک ایک وقت میں ہزاروں اور کبھی لاکھوں لوگوں کو ان کے وطن، گھر، تہذیب اور روایات سے اکھاڑ کر دربدر خاک بسر کرتی آئی ہیں۔

انسانی آفتوں کی فہرست طویل ہے مگر اس میں چند نام سرفہرست ہیں۔ مقدونی بادشاہ سکندر کو اپنے نام کے ساتھ "اعظم" کا لاحقہ لگانے کا حق اس وقت ملا جب وہ یورپ اور ایشیا میں اپنی پیش قدمی کے پیچھے تباہی اور بربادی کی لرزہ خیز داستانیں چھوڑنے میں کامیاب ہوا۔ حجاج بن یوسف، مختار بن عبیدہ ثقفی، ابوعبداللہ سفاح اور ابومسلم خراسانی، بابک خرمی ہزاروں بے گناہ انسانوں، مسلمانوں، بشمول جید علماء، صلحاء اور اتقیاء کے قتل عام پر بہیمانہ فخر کے مجرم بنے ہوئے آج بھی تاریخ کی عدالت میں فیصلہ کے منتظر ہیں۔ منگول سرداروں چنگیز اور ہلاکو نے چند برس کی مدت میں دنیا کی سب سے بڑی علمی تہذیب اور اس کے بیش قیمت آثار کو یوں مٹا دیا کہ اب ساری دنیا مل کر بھی اس جیسا علم دوبارہ مرتب نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ جو انسانی المیہ ان دو سفاکوں نے اپنی تلواروں کی نوکوں کو انسانی خون میں ڈبو کر لکھا اس کا ایک ایک حرف ابلیس صفت سرداروں کو آج تک خوش کرتا ہے جس کے اظہار کے لیے وہ منگولیہ تک دوڑ لگا سکتے ہیں۔ اسپین کے کروسیڈی بادشاہ و ملکہ فرڈنڈ اور ازابیلا اور ان کے پاگل پادری کارڈینل زِی مینس کے حکم سے اور نگرانی میں لاکھوں انسانوں کو قتل کیا گیا۔ زِی مینس کی نگرانی میں شراب کے نشے میں دھت قاتل گروہوں نے ۱۵۷۰ء کے آل سینٹس ڈے (All Saints Day) کے موقع پر بقول برطانوی مورخ اسٹینلی لین پول کے پچاس ہزار مسلمانوں کو فقط ایک دن میں شہید کیا تھا (۱۰)۔ کئی لاکھ مسلمانوں اور یہودیوں کا مذہب جبراً بدلا گیا اور اس سے زیادہ تعداد میں لوگوں کو ملک بدر کیا گیا تاکہ ان کی املاک پر عیسائی قبضہ کر سکیں۔ مزاجاً مسلم دشمن امریکی افسانہ نگار اور مورخ واشنگٹن اروِنگ (۱۷۸۳-۱۸۵۹ء) سقوط غرناطہ کے روزنامچہ میں اعتراف کرتا ہے کہ جب فرڈنڈ کی فوج نے اندلس کے مسلم تہذیبی مرکز مالقہ (Malaga) پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کے جبری انخلاء کے دوران کسی مرد عورت کو زر و جواہر، مال اسباب ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی گئی تھی اور شرپسند فوجی

سارا مال ہتھیا کر ان مجبور انسانوں کو صرف بدن کے کپڑوں میں گھروں سے نکال دیتے تھے۔(۱۱)

دوسری عالمی جنگ نے، جو درحقیقت یورپی ممالک کے مابین اقتصادی مفادات کا مہیب ٹکراؤ تھی، سفاکی اور بے رحمی کے سارے پچھلے رکارڈ توڑ ڈالے۔ اس جنگ میں ڈھائی کروڑ لڑاکے مارے گئے، جبکہ مرنے والے غیر مسلح عام شہریوں کی تعداد ناقابل یقین حد تک بے شمار کروڑوں میں تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو لاکھوں بے گھر لوگ یورپ کے تباہ حال میں مارے مارے پھرے اور ان میں سے جو کوئی وسائل مہیا کر سکا وہ امریکہ، کینڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں جا بسا۔

طویل انسانی تاریخ میں سفاکی اور خون آشامی کے یہ آٹھ دس واقعات اپنے ذکر میں قتال عام تک محدود ہیں۔ مورخین نے عموماً ان سفاک انسانوں کے دیگر بہیمانہ کارناموں کو نظر انداز کر دیا۔ سکندر بلقان اور یونان سے تقریباً ایک لاکھ فوجی لے کر اپنی جنگی مہم پر نکلا تھا۔ ان فوجیوں میں سے جو زندہ بچ گئے تھے ان کی غالب اکثریت کو دوبارہ اپنے وطن واپسی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ بے گھر بے در لوگ ترکستان، افغان، فارس، عراق، شام اور اناطولیہ میں اپنی شناخت کھو کر ہم رنگ زمیں یا پیوند زمیں ہو گئے۔ سات برس میں سکندر نے فارس کی اخمیدی شہنشاہیت کے پرخچے اڑا دیے، دارا ثالث کے اسطوری خزانہ پر قبضہ جمایا اور فوجیوں کو کئی روز تک تخت جمشید/شیراز کے بازاروں اور گھروں میں عوامی املاک کی لوٹ مار کی کھلی چھوٹ دی اور جب سب کچھ لٹ گیا تو سارے شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ کسی کو خبر نہیں اس شہر کے اور فارس کے دیگر مفتوحہ شہروں کے لوگ کہاں بکھر گئے۔ فارس کے خلاف اس کی سات سالہ جنگوں کے دوران لاتعداد فارسی بے گھر، بے در، بے زر ہو گئے، دن رات عیش شبانہ میں مدہوش رہنے والے نان شبینہ کو محتاج کر دیے گئے۔ یہی سب کچھ اناطولیہ، شام و عراق، افغان اور ترکستان میں ہوا۔ سکندری غارت گری میں برباد ہو جانے والے لاکھوں عام اور معصوم انسانوں کی گنتی سے تاریخ کے بیانات خالی ہیں۔

اہل تہذیب کا جہل تہذیب: ابوحرب، ابومسلم خراسانی اور بابک خرمی اور ان کے ساتھ حجاج ابن یوسف کو ابو منصور عبدالملک ثعلبی نے ان چار لوگوں میں شمار کیا ہے جنھوں نے ایک لاکھ سے زیادہ افراد کو قتل کیا۔ حجاج کے مقتولین میں صحابہ بھی شامل تھے۔ حجاج نے ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل نہیں کیا تھا، ایک لاکھ سے زیادہ خاندانوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ اس کے معاوضہ میں ابوالعباس سفاح

اور اس کے حوالی موالی نے حجاج کے ولی نعمت خاندان بنی امیہ کے ساتھ خصوصاً اور ایران و خراسان میں رہنے والے عربوں کے ساتھ عموماً جو کچھ کیا وہ تاریخ میں موجود ہے مگر اس کا ذکر اسی طرح باعث شرم ہے جیسے حجاج بن یوسف کے جرائم۔

چنگیز و ہلاکو نے جہاں لاتعداد انسانوں لقمۂ اجل بنایا وہاں لاتعداد بسے بسائے انسانوں کو ایسے پناہ ڈھونڈنے والوں میں بدل دیا جو زمین پر کہیں بھی پناہ گزیں نہ بن سکے، مگر یہ ان قبائلی سرداروں کا قصہ ہے جنہوں نے کبھی تہذیب یافتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بیسویں صدی کے سرداروں کو تہذیب و ثقافت کا غرور ہے اور یہی صدی انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ اندوہناک مدت ثابت ہوئی ہے۔ جتنا انسانی خون اس ایک صدی میں بہایا گیا ہے قتل ہابیل سے ۳۱/دسمبر ۱۹۰۰ء تک کل ملا کر اتنے لوگ نہیں مارے گئے ہوں گے۔ بیسویں صدی میں قتال عام اور نسل کشی کی جو وارداتیں ہوئی ہیں ان میں پانچ کروڑ نوے لاکھ انسان کھیت ہوئے تھے۔ ان کا جرم بس یہ تھا کہ ان کا کوئی جرم نہیں تھا یا یہ تھا کہ وہ بس انسان تھے، بے بس انسان تھے۔ دوسری عالمی جنگ میں اموات کے علاوہ ایک کروڑ بیس لاکھ افراد صرف یورپ میں بے گھر بے در ہوئے تھے اور سینہ میں اپنا درد سمیٹے ساری دنیا میں نمک کی طرح تحلیل ہو گئے۔

ایک سکندر کے استثناء کے ساتھ باقی تمام انسانی مظالم مدینۃ النبی میں پناہ دینے والوں کی مثال قائم ہونے کے بعد کے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ نے یورپ کی برباد شدہ معیشتوں کی تعمیر نو کے لیے مشروط امداد دی تھی: کمیونسٹ دنیا میں رائج ایک باغی یورپی نظام فکر کے خلاف اور امریکہ کے زیر تسلط سرمایہ داری اور سودی نظام کے کل پرزے بننے کے لیے۔

غیر مشروط نصرت کا فیضان: انصار مدینہ نے مہاجرین کے سامنے کوئی مادی شرط نہیں رکھی تھی۔ ایمان کی شرط بے شک تھی۔ مگر مادی اور نفسیاتی نصرت و امداد کا کوئی معاوضہ انصار نے کسی مہاجر سے نہیں مانگا تھا۔ اس کے برعکس عہد سکندر سے دوسری عالمی جنگ اور اس کے بعد کی دس سے زیادہ ''علاقائی'' جنگوں نے سوا دو ہزار سال کے دوران کروڑوں انسانوں کو دیدہ و دانستہ یوں بے گھر اور بے وطن کیا کہ تخلیق آدمؑ کے وقت سرشت آدم کے بارے میں ملائکہ کا مودبانہ شبہ بار بار یاد آتا ہے (۱۲)، سوا ایک وقت کے جب انصار نے اپنے عمل سے اس شبہ کو زائل کیا تھا۔ انہوں نے مہاجرین کی نہ

صرف اخلاقی حمایت کی بلکہ انہیں اس معیار کی مادی امداد مہیا کی کہ مہاجرین نئے شہر میں بڑی سہولت سے دوبارہ اپنا پرانا معاشی اور معاشرتی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ دنیا کی تاریخ میں انصار وہ واحد انسانی گروہ ثابت ہوئے جنھوں نے مہاجرین کی ایسی برادرانہ پذیرائی کی کہ وہ اپنے سارے دکھ بھول گئے۔ انصار نے اپنی ملکیت کی ہر شے مہاجرین کے قدموں میں لاکر ڈال دی تھی۔

یہی انصار کی ہجرت تھی۔ یہ ہجرت بھی مہاجرین کی قربانیوں سے کم نہیں تھی، جنہیں ان کے اپنے عزیز اقربا نے بے گھر، بے در اور بے زر کیا تھا۔

انصار کے سامنے پہلا مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری، بلکہ اس سے بھی پہلے فوری قیام کا تھا، یہ نئے آنے والے کئی ہزار تھے۔ انہوں نے مہاجرین اور ان کے خاندانوں کے لیے اپنے گھروں کے دروازہ کھول دیے تھے، مواخات نے مہاجرین کے ساتھ ان کی برادری بنادی تھی اور انصار نے مہاجرین کو اپنے بھائیوں سے زیادہ سمجھا، اس معاملہ میں اگرچہ سارے ہی انصار امتیازی شان رکھتے ہیں، لیکن بعض بزرگوں نے تو برادرانہ محبت اور ایثار کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ سن کر ہی آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

بے نظیر قربانیوں کے عجیب قصے: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ مکہ میں ایک متمول تاجر تھے۔ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مدینہ میں مواخات کے تحت حضرت سعد بن الربیع انصاریؓ کو ان کا بھائی بنایا گیا۔ حضرت سعد بھی مدینہ کے بہت مالدار افراد میں سے تھے۔ بھائی بندی کے بعد انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن سے کہا کہ ”میں مدینہ کا سب سے دولت مند شخص ہوں۔ میں اپنی آدھی جائداد آپ کو دیتا ہوں۔ دو باغ ہیں، ایک آپ لے لیجیے۔ اس کے علاوہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے آپ پسند کریں، میں اسے علاحدہ کردوں گا پھر آپ اس سے نکاح کرلیں“۔

اس ایثار پر حضرت عبدالرحمٰن حیرت میں ڈوب گئے۔ اس طرح کی قربانی کا تو کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ انہوں نے دعا دیتے ہوئے حضرت سعد کا بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کی دولت، ان کے باغات اور ان کی بیویاں ان کو مبارک ہوں۔ ”بھائی میں تو ایک تاجر آدمی ہوں۔ مجھے منڈی کا راستہ بتادیجیے“۔ حضرت سعدؓ انہیں یہودی قبیلہ بنی قینقاع کے بازار میں لے گئے۔ دن بھر میں وہاں خشک دہی اور مکھن کی آڑھت سے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ایک رقم کمائی اور شام ڈھلے لاکر

حضرت سعدؓ کی نذر کی۔(۱۳)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب مواخات کا نظام قائم ہوگیا تو انصار نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ باغوں میں ان کے کھجوروں کے درخت ان کے اور مہاجرین کے مابین برابر برابر بانٹ دئے جائیں۔رسول اللہؐ انصار اس مثالی جذبہ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے۔آخر بیعت عقبہ ثانیہ کی رات میں ان لوگوں نے یہی وعدہ تو کیا تھا۔مگر رسول اللہؐ ایک عملی انسان تھے۔انہوں نے انصار کی درخواست قبول نہ کی۔اس پر انصار نے نئی تجویز پیش کی کہ مہاجرین ان کے ساتھ ان کے باغوں اور کھیتوں میں کام کریں اور فصل آدھی آدھی بانٹ لیا کریں۔یہ تجویز مہاجرین کے دل کو بھی بھائی (۱۴)۔ اس طرح ایک نئے ماحول میں مہاجرین کی ایک خاصی بڑی تعداد کو روزگار مل گیا اور دوسری طرف انصار کے باغوں اور کھیتوں کی پیداوار میں ایک دم بھاری اضافہ ہوگیا جو دونوں جماعتوں کے لیے مادی طور پر اور بھی منافع بخش ثابت ہوا۔زرعی پیداوار میں اچانک بڑے اضافہ سے مدینہ میں اقتصادی نظام زیادہ متحرک ہوگیا، جس کی وجہ سے شہر کی اقتصادی برتری یہود کے ہاتھوں سے نکل کر انصار اور مسلمانوں کو حاصل ہوگئی۔ مالک ابن عجلان کے انقلاب کے بعد بنی قبیلہ کو سیاسی برتری حاصل ہوئی تھی مگر اقتصاد کی کنجیاں بعد کے تقریباً سوا سو سال میں بھی یہود ہی کے ہاتھوں میں رہی تھیں۔مواخات کے نتیجہ میں اس میدان میں انصار نے پہلی بار یہود کو شکست دی تھی اور اس کامیابی میں مہاجرین کا برابر کا حصہ تھا۔یہ ہمہ گیر ملی کامیابی تھی۔

مہاجرین سے انصار کے تعلق خاطر کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہؐ نے انصار کو طلب فرمایا اور بحرین کا علاقہ انہیں پیش کیا۔خلیج فارس کے مغربی کنارہ پر عراق کے جنوب میں جزیرۃ العرب کا وہ خطہ بھی شادابی اور زرخیزی اور اقتصادی امکانات کے لیے معروف تھا۔مگر رسول اللہؐ کی پیش کش پر انصار کا جواب تھا کہ جب تک اس میں مہاجرین کا برابر کا حصہ نہیں رکھا جائے گا وہ اس علاقہ کی ملکیت قبول نہیں کریں گے۔

عہد جدید کا ہراول دستہ: اس پر رسول اللہؐ نے مستقبل کی ایک پیشین گوئی کی۔آپؐ نے انصار سے فرمایا: ”تو پھر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے حوض کوثر پر ملاقات کرو، کیونکہ وہ وقت آئے گا جب دوسروں کو تم پر فوقیت دی جائے گی“۔(۱۵)

بیان بالکل واضح تھا، مگر انصار نے فیصلہ تبدیل نہیں کیا۔ رسول اللہؐ اور مہاجرین کے معاملہ میں انصار دنیوی سودے بازی کے قائل نہیں تھے۔ اس کے برعکس ایسے تمام مواقع پر وہ یہ دیکھتے تھے کہ مہاجرین کے لیے زیادہ سے زیادہ کیا ایثار ان پر لازم تھا۔ جب وقت آتا تو زیادہ کیا سب کچھ ان مہاجرین کے لیے چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے۔

وہ تمام بزرگ جنھوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی تھی دنیا کے سب سے زیادہ ذہین انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مذہب کے بارے میں دنیا کے عام تاثر کے برعکس اسلام حقوق العباد کے معاملہ میں بہت مختلف اور منفرد دین تھا۔ وہ دور بین اور مستقبل شناس لوگ صاف دیکھ رہے تھے کہ قرون وسطیٰ اور عہد جاہلیت آخری سانسیں لے رہا تھا اور عہد جدید عالم انسانیت کے سینوں اور دماغوں پر دستک دے رہا تھا۔ ان کے کان نئے زمانہ کی آہٹیں سن رہے تھے اور انہیں خبر تھی کہ وہ خود اس نئے دور کا ہراول دستہ تھے اور یہ انہی کی ذمہ داری تھی کہ دنیا میں وہ مکمل انقلاب برپا کر دکھائیں جس کے لیے یوم تکوین کو دست قدرت نے انہیں بنایا تھا۔ جہل اور تجاہل کی اندھیریوں کو کاٹنے والا صبح کا تڑکا وہی تھے۔ انہیں دنیا میں پہلی علمی تہذیب بنانے کا کام سونپا گیا تھا۔ وہ تہذیب جس کے عمرانی خدوخال متواتر نازل ہونے والی آیات قرآنی اور رسول اللہؐ کی احادیث میں ان کو دکھائے جا رہے تھے۔ اس مہم کی تکمیل ہی انصار کا معاوضہ تھی۔ اس حقیقت کو ان سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ عقبۂ ثانیہ کی مجلس میں جب انہوں نے پوچھا تھا کہ وہ سب کچھ کرنے کے بعد جس کا ان سے مطالبہ تھا بدلے میں انہیں کیا ملے گا، تو رسول اللہؐ نے فرمادیا تھا کہ ان کا معاوضہ جنت ہوگی۔ اسی دن انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ انہیں دنیا سے اب کوئی مطلب نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی اسی بے نیازی کی تصدیق مزید کرتے ہوئے ہی رسول اللہؐ نے ان کو حکم دیا تھا جب دنیا میں انہیں نظر انداز کیا جائے تو قیامت کے دن اپنی تمام تر قربانیوں اور ایثار کا معاوضہ لینے کے لیے حوض کوثر پر ان کے پاس جمع ہو جائیں۔

کیسی عجیب بات ہوگی کہ حوض کوثر پر انصار اس حالت میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے کہ ان کے ہاتھ دنیا سے خالی ہوں گے اور جب میدان حشر سے ان کے قافلے نکلیں گے تو ان کے دامن اور جھولیاں سب بھری ہوئی ہوں گی۔

قصہ مختصر، انصار کی ہجرت مال و متاع سے بھی ہجرت تھی اور دنیا سے بھی وہ ہجرت تھی کہ ان

سے پہلے کسی نے ہجرت کی وہ مثال نہیں دیکھی تھی۔

دنیا سے ہجرت نے انصار کو دنیا بیزار راہب نہیں بنا دیا تھا۔ترک دنیا سے ان کا مقصد اسباب دنیا سے بے نیازی تھا۔اپنا سب کچھ امت پر لٹانے کے بعد جب ان کو معلوم ہوا کہ اس دنیا میں انہیں کچھ نہیں ملے گا تو ان باشعور انسانوں کی فطرت نے انہیں ایثار کی ایک اور راہ دکھائی جس پر وہ اجتماعی طور پر گامزن ہوگئے۔ یہ علم تہذیب اور تہذیب علم کی راہ تھی۔مسلمانوں میں خاص طور سے تہذیب کے عروج کے زمانہ میں بے شمار علماء اور ارباب دانش پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن وحدیث کے مثبت تجزیاتی فہم سے کئی نئے علوم دریافت کیے۔شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اہل علم کی ان فوجوں میں سب سے بڑا رسالہ انصار علماء پر مبنی ہے۔

ہجرت کی قیمت: ہجرت تمام انبیاء کی سنت ہے۔ ہر نبی نے اپنا اتباع کرنے والوں کے ساتھ دارالانکار اور دارالعصیان سے دارالامن اور دارالسلام کی طرف ہجرت کی ہے۔اسی سنت متواترہ کی وجہ سے یہ دنیا اب تک مکمل تباہی سے بچی ہوئی ہے۔البتہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے واسطے ہجرت خود ایک بڑا امتحان تھی۔اس امتحان میں پورا اترنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔نہ یہ چند نیک خواہشات کے اظہار کا نام تھی۔اسی لیے اس خدمت کے لیے اللہ نے ایک خاص جماعت کو منتخب کیا تھا اور وہ جماعت اس آزمائش میں پوری بھی اتری تھی۔یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ انصاری کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے ایک اعرابی صحابیؓ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بس بھلے کام کرتے رہیں، ہجرت کا خیال دل میں نہ لائیں۔(۱۶)

مسلمانوں کے لیے عہد نبوی میں اور اب بھی ہجرت صرف جائے قیام کو بدل دینے یا ظالم قوم اور ظالم حکمرانوں کے ڈر سے فرار ہونے یا مالی اور دنیاوی منفعت کے لیے کسی ہری چراہ گاہ میں جانے کا نام نہیں تھا۔ یہ بڑی تعداد میں ان لوگوں کی نقل مکانی کا عنوان تھا جو اس دنیا کو اچھے انسانوں کے رہنے کی جگہ بنانے کا عزم رکھتے تھے، یہ جانتے ہوئے کہ نسل انسانی کی فلاح و بہبود کی سب سے بڑی دشمن خود نسل انسانی ہی تھی اور عادات بد اور گمراہی میں محصور معاشروں کے لیے تبدیلی سب سے مشکل کام تھا اور آج بھی ہے۔

یہاں عقبہ ثانیہ کے اجتماع میں حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاریؓ کا اعلان یاد آتا ہے

کہ اسلام قبول کرنے کا مطلب ”عرب اور غیر عرب، کالے ہوں یا گورے، ساری دنیا کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ یہ اپنی دولت، اپنی جانوں، اپنے رہنماؤں کی قربانیاں پیش کرنے کا نام ہے“۔(۱۷)

اس اعلان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مسلمان تلوار اٹھا کر دنیا میں معصوم اور بے ضرر انسانوں کا قتل عام کرنے کو نکل کھڑے ہوں۔ یہ کام، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، اسلام کے بغیر، اسلام سے پہلے بھی اور اسلام آنے کے بعد بھی، دوسری بے شمار قومیں بہت بڑے پیمانے پر کرتی آئی ہیں اور اب بھی کرتی ہیں۔ عقبہ کی گھاٹی کے اس اجتماع میں درحقیقت معاملہ برعکس تھا۔ حضرت عباس بن عبادہؓ نے اوس وخزرج کو مخاطب کرکے دراصل ایک پیشین گوئی کی تھی اور وہ یہ کہ جوں ہی تم اسلام قبول کروگے دنیا کی تمام منفی اور تخریبی قوتیں، مفادات پرست گروہ، شرک اور کفر پر کمربستہ قومیں، زمین پر ہر وقت فتنہ و فساد برپا رکھنے والی ٹولیاں، وہ عرب ہوں یا عجمی، سفید فام ہوں یا رنگ دار، مشرق کے باشندے ہوں یا مغرب میں رہنے والے، سب غول در غول تمہارے خلاف جمع اور تمہاری دشمنی پر کمربستہ ہوجائیں گے۔ پھر تاریخ بھی بتاتی ہے کہ یہی تو ہوا۔ مسلمان انسان کی فطری خوبیوں اور مثبت صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے عزم سے اٹھے تو ہر چہار طرف سے ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ انسانی فلاح اور مادی وروحانی ترقی کے تمام منصوبوں کو غارت کرنے کے لیے گروہ در گروہ لوگ جمع ہوئے۔

آل اسماعیلؑ کی دو خصوصیات: حضرت عباس بن نضلہ انصاریؓ کا یہ انتباہ تورات کے اس ربانی اعلان کی بازگشت تھا جس میں بزبان الٰہی حضرت اسماعیلؑ کی دو خصوصیات یہ بتائی گئی تھیں کہ ”اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے“ اور وہ اپنے ”سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا“ (۱۸) یعنی دین حنیف کی تبلیغ وترویج میں حضرت اسماعیلؑ اور ان کی مومن نسلوں کو ساری دنیا کی مخالفت اور عناد کا سامنا کرنا پڑے گا اور تمام انسانوں کے لیے ان کو اور ان کی دینی ذریت کو حق اور راست بازی کے نمونہ کے طور پر باقی رکھا جائے گا۔(۱۹)

مالک ابن عجلان جیسے انقلابی کے پڑپوتے، حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ بن مالک بن عجلانؓ نے اسی لیے دوٹوک الفاظ میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا کہ نسل در نسل قیامت تک ان طاقتوں سے لڑنے کا حوصلہ اور مسلسل قربانیاں دینے کا حوصلہ نہیں ہے تو ابھی قدم پیچھے ہٹا لو اور کوئی وعدہ کیے بغیر اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔

رسول اللہؐ کی ایک پیشین گوئی کے مطابق دنیا میں انصار کی تعداد روز بروز گھٹتی جارہی ہے اور اسی کے ساتھ خود پر امت کو ترجیح دینے والوں، امت کی خاطر مال اور جان کی قربانی دینے والوں کا قحط بھی پڑتا جارہا ہے۔ تو پھر امت کا آج جو حال ہے اس کے سبب پوچھنے کی کیا ضرورت رہ گئی۔

کوئی جائے حیرت نہیں کہ انصار کو اپنے مہاجر بھائیوں کی مادی اعانت کی بہت بھاری قیمت چکانی پڑی اور انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے وہ قیمت ادا کردی اور ہجرت کے تصور اور نظریہ کو ایک نیا مفہوم اور نیا آہنگ دے دیا۔

حواشی

(۱) امام بخاری، الجامع الصحیح/تفہیم البخاری: مولانا ظہور الباری اعظمی، دارالاشاعت کراچی ۳: ۵۵۲/ ح ۱۴۰۴۔

(۲) امام بخاری، الجامع الصحیح، عن ام المومنین حضرت عائشہ الصدیقہؓ، ۵: ۵۸: ۲۴۵، ہیکل، محمد حسین، ابوبکر (ار)، میری لائبریری، لاہور، (۱۹۷۳ء) ۴۳۔ (۳) ابن ہشام، سیرۃ النبی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱: ۵۱۵۔ (۴) ابن ہشام، سیرۃ النبی، ۱: ۵۴۹۔ (۵) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ (سیرۃ النبی)، مکتبہ قدوسیہ لاہور، (۱۹۹۶ء) ۱: ۲۰۱۔ (۶) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱: ۴۴۸، قاسمی، مولانا محمد اسلمؒ، سیرت حلبیہ اردو، زکریا بک ڈپو دیوبند، ۳: ۶۹-۷۰۔

(۷) ابن سعد، طبقات الکبریٰ/ ار: نفیس اکیڈمی کراچی، ۲: ۲۱۰/ ۲۱۴۔ (۸) غازی، محمد طارق، نظریہ تہذیب، اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی، (۲۰۱۷ء)، ص ۱۶۸۔ (۹) القرآن، الشعراء ۲۶: ۲۱۴، قاسمی، سیرۃ حلبیہ اردو، ۲: ۲۴۸۔

(۱۰) لین۔پول، اسٹینلی، دی اسٹوری آف دی مورس ان اسپین، ۲۷۵-۲۷۸۔

Stanley Lane-Poole, *The Story of the Moors in Spain* 275-278

(۱۱) اروِنگ، واشنگٹن، اے کرانیکل آف دی کونکویسٹ آف گراناڈا--۶۶: ۱۷۴۔

Irving, Washington. *A Chronicle of the Conquest of Granada*, Sunnyside 1850

(۱۲) القرآن، البقرہ ۲: ۳۰۔ یہ فساد پھیلائیں گے اور خون بہائیں گے۔ (۱۳) ابن سعد، طبقات الکبریٰ، ۲: ۲۱۰۔ (۱۴) امام بخاری، الجامع الصحیح، ۵: ۵۸: ۱۲۴۔ (۱۵) امام بخاری، الجامع الصحیح، ۵: ۵۸: ۱۳۸۔ (۱۶) امام بخاری، الجامع الصحیح (انگ)، ۲: ۲۴: ۵۳۲۔ (۱۷) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱: ۴۳۶، میاں سید محمد، محمد رسول اللہ، کتابستان دہلی (۱۹۷۳ء)، ص ۳۲۷۔ (۱۸) بائبل، سفر تکوین (پیدائش) ۱۶: ۱۲۔ (۱۹) غازی، محمد طارق، نظریہ تہذیب، ۱۳۱۔

سر سید کے افکار اور جنوبی ہند

ڈاکٹر راہی فدائی

جنوبی ہند کی سرزمین کئی خصوصیات کی حامل ہے۔ان میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی معتدل آب وہوا اور اس کی خنک فضاؤں میں ''انجذاب'' کی کیفیت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔اسی جذب واخذ کی صفت وصلاحیت کی فراوانی کے باعث یہاں کے اہل علم وفضل میں وسیع النظری اور اصحاب دانش وبینش میں فراخ دلی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کا بے انتہا فضل واحسان ہے کہ خاک جنوب میں صحابۂ کرام، تابعین عظام، مفسرین ومحدثین، علما وصوفیہ، اولیا و اتقیا آسودہ خواب ہیں جن کی پاکیزہ اصلاحی تعلیمات وخصوصی باطنی توجہات نے اس وسیع وعریض قطعۂ جنوب کے عالموں اور دانشوروں کو جذب واخذ کے وقت اعتماد کے ساتھ احتیاط کو مدنظر رکھنے کی تلقین کی۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند سے آنے والی ہر دینی، علمی وادبی تحریک کی خوبیوں اور بھلائیوں کو یہاں کی فضاؤں نے بہ طیب خاطر جذب کیا اور ان تحریکات کے مثبت وکارآمد پہلوؤں کو اپنے اپنے حلقوں میں متعارف کرایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں نمو پذیر تحریکیں مثلاً علی گڑھ تحریک، ندوہ تحریک، دعوت وارشاد تحریک وغیرہ جب پہلی بار جنوبی ہند پہنچیں تو یہاں کے اہل علم نے نہ صرف ان کی پذیرائی کی اور بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا بلکہ اہل ثروت کو بھی ان کی تائید کے لیے آمادہ کیا چنانچہ ۲۷/ ۲۸/ ۲۹/دسمبر ۱۹۰۱ء کو سر سید کے زیر سرپرستی قائم شدہ محمڈن انگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا پندرھواں سالانہ اجلاس بمقام مدراس زیر صدارت نواب محسن الملک سید مہدی علی (متوفی ۱۹۰۷) منعقد ہوا تو دامے درمے، سخنے، قدمے تائید کرنے والوں میں ہندوستان کے اولین مدرسہ جامعہ باقیات الصالحات ویلور، تمل ناڈو (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے

نمبر ۲۱، تیسرا کراس، عثمان اسٹریٹ، خوش حال نگر، کے جی ہلی، بنگلور۔۴۵۔ (Mob: 9448166536)

بانی حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری (متوفی ۱۹۱۸ء) بھی تھے جنہوں نے اپنے فرزند علامہ قاری خان بہادر ضیاء الدین محمد (متوفی ۱۹۴۱ء) تلمیذ خاص حضرت رحمت اللہ کیرانوی ورکن مجلس شوریٰ ندوۃ العلماء اور مدرسہ کے صدر المدرسین شمس العلماء حضرت علامہ شیخ عبدالجبار باقوی (متوفی ۱۹۳۴ء) کو نہ صرف اجلاس میں شرکت کے لیے روانہ فرمایا بلکہ اجلاس سے پیشتر مدرسہ کے ایک سینئر استاذ سلطان الواعظین حضرت علامہ عبدالقادر بادشاہ باقوی کو شمالی آرکاٹ کے شہروں میں مذکورہ اجلاس کے ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے بھجوایا(۱) تاکہ اس عظیم جلسے کے اخراجات کے لیے مالیہ فراہم ہو سکے۔ علاوہ ازیں اس میں حکمت عملی یہ بھی تھی کہ ٹکٹ خریدنے والے اہل ثروت کا علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے رابطہ استوار ہو جائے۔ غرض کہ مذکورہ دونوں بزرگ اجلاس میں شریک رہے اور بحث ومباحثہ میں دلجمعی کے ساتھ حصہ لیا جس کی تفصیل اجلاس کی مطبوعہ روداد میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۲)

علی گڑھ کی مذکورہ کانفرنس کے بعد جنوبی ہند کے طول وعرض میں سرسید کے افکار کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کے ذہن ودل میں انگریزی تعلیم کے حصول کا جذبہ اور جدید ونافع علوم کے اکتساب کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ گو قطعۂ جنوب میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے پیشتر ہی علوم جدیدہ کی تحصیل خصوصاً انگریزی تعلیم کو برا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں مدراس، بنگلور، حیدرآباد شہروں میں انگریزی تعلیم یافتہ افراد موجود تھے اور ان میں تاجر و ملازم پیشہ بھی تھے مگر ان کی تعداد قدرے کم تھی۔ جب سرسید کے افکار کی گونج چاروں طرف سنائی دی تو لوگوں میں دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی تعلیم کے حصول کا شوق سر اٹھانے لگا اور عصری علوم وفنون کو سیکھنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اس موقع پر یہ بات جاننا ضروری ہے کہ اس وقت شمالی ہند کے حالات کیا تھے اور اس تعلق سے سرسید کی سوچ کیا تھی؟ ان سوالات کا جواب بقول پروفیسر آل احمد سرور یہ ہے

> ”یہ دور ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً بڑی مصیبت کا تھا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد بڑا ظلم کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں عام طور پر ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی مگر سرسید کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نیا سیاسی نظام اپنے ساتھ بہت سی لعنتوں کے باوجود برکتیں بھی لایا ہے اور ان برکتوں سے روگردانی کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ قدیم

نظام کی فرسودہ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے اور علوم مغربی اور جدید زندگی کی ضروریات سے غافل تھے اس لیے انہوں نے ۱۸۶۳ء میں ''التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم اہل ہند'' شائع کیا''۔(۳)

اسی مقصد کے تحت انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے ۱۸۷۰ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نکالا جس میں اپنے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طرح تحریر کیا:

''اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں''۔(۴)

سرسید کے بعض عقائد اور قرآن مجید کی تفسیری تشریحات سے علماء کو اختلاف تھا جس کا اظہار انہوں نے برملا کیا مگر سرسید کو اس کی پروا نہیں تھی اور وہ اپنے متنازع آراء پر مصر بھی نہیں تھے۔ اسی لیے ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج قائم کیا تو بقول پروفیسر آل احمد سرور ''سرسید نے اپنے مذہبی خیالات کو کالج کے نصاب میں جگہ نہ دی بلکہ دینیات کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق رکھی تاکہ ادارے کی مخالفت کم ہو''۔(۵)

ٹمل ناڈو: غرض علمائے جنوب نے سرسید کے بعض دینی ترجیحات سے اختلاف کے باوجود سرسید کی تعلیمی تحریک کا کھل کر ساتھ دیا۔ یہ ان کی وسعت قلبی و وسیع النظری کی دلیل ہی نہیں بلکہ ان علماء کی دقت نظری، حکمت عملی اور مستقبل شناسی کا واضح ثبوت ہے۔ یہاں کے اہل علم ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے دینی احساسات کی تازگی کے ہم دوش دنیوی افادات کی تازہ کاری بھی جاری رہے تاکہ دنیا و عقبی دونوں میں ان کی کامیابی یقینی بن جائے۔ ادھر عوام الناس نے بھی اپنے خواص و اکابر کی رہنمائی کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان کے ارشادات کی تعمیل خوش دلی سے کرتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ تعلیمی بیداری کو عام کرنے کی خاطر سرسید کی تحریک کی توسیع کے طور پر ۷/جمادی الآخر ۱۳۲۴ھ مطابق ۳۰/جولائی ۱۹۰۶ء کو ام المدارس مدرسہ باقیات صالحات ویلور میں مجلس تعلیمی اہل اسلام جنوبی ہند (South Indian Muslim Educational Committee) کا

انعقاد عمل میں آیا جس میں اکیس تحریکیں منظور کی گئیں، جس میں سے یہاں دو کا ذکر بے محل نہ ہوگا:

ا۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ علمائے اسلام کو انگریزی سیکھنے اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عربی میں ضروری استعداد حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے اور انہیں ان مقاصد کے لیے وظائف دیے جائیں۔ اس تحریر کو مولوی حکیم محمد محی الدین حسین چیدہ (متوفی ۱۳۳۶ھ) صدر مدرس مدرسہ لطیفیہ ویلور نے پیش کیا جو منظور کر لی گئی۔

۲۔ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ گورنمنٹ بورڈ اور منسپل اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے مخصوص ہیں، مسلمانوں کو ان کے ذاتی خرچ سے دینی تعلیم دینے کے اجازت دی جائے جیسا کہ ''گورنمنٹ مدرسہ اعظم'' مدراس کے لیے دی گئی ہے۔ یہ تحریک بھی منظور کر لی گئی۔ (۶)

ایس آئی ایم ای سی (S.I.M.E.C) میں منظور شدہ آراء کو روبہ عمل لانے کے لیے خوب جدو جہد کی گئی جس کے نتیجے میں دینی مدارس کے ساتھ عصری تعلیم گاہیں بھی قائم ہوئیں۔ ویلور ضلع میں واقع شہر وانمباڑی میں ''وانمباڑی ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے زیر سرپرستی ۱۹۱۲ء میں ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ٹھیک چار سال بعد مذکورہ سوسائٹی کے ذمہ داروں نے ۱۹۱۶ء میں وانمباڑی ہی میں ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' منعقد کی جس میں سرسید مرحوم کے پوتے سر راس مسعود (متوفی ۱۹۳۷ء) نے شرکت کی۔ یہ اجلاس سر اکبر حیدری (متوفی ۱۹۴۲ء) کی صدارت میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا جس کا عمدہ نتیجہ ۱۹۱۹ء میں اسلامیہ کالج کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ آج اس ''اے'' گریڈ کالج میں پوسٹ گریجویٹ کورسس چل رہے ہیں اور یہ ہسٹری، کامرس، حساب اور کمسٹری میں یو۔ جی۔ سی سے منظور شدہ ریسرچ سنٹر کے طور پر کارکردہے۔ (۷)

اسی طرح تاجران چرم کے مشہور شہر ''میل وشارم، ضلع ویلور ٹمل ناڈو'' میں میل وشارم مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی زیر سرپرستی نواب سی عبدالحکیم (متوفی ۱۹۳۸ء) ۱۹۱۸ء میں وجود پذیر ہوئی جس کے تحت ۱۹۶۵ء میں سی عبدالحکیم کالج فار آرٹ اینڈ سائنس اور ۱۹۹۸ء میں انجینئرنگ کالج قائم کیے گئے جہاں تحقیقی شعبے بھی موجود ہیں۔ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر مدراس کے ایک بڑے تاجر ایم جمال محمد صاحب نے ''ترچی، ٹمل ناڈو'' میں جمال محمد کالج کا سنگ بنیاد ۱۹۵۱ء میں رکھا جو آج ایک عظیم مرکز تعلیم اور سرچشمۂ علم بنا ہوا ہے۔

چنائی (مدراس) کے بعض اہل ثروت نے مسلم ایجوکیشنل اسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی داغ بیل ڈالی جس کے نتیجے کے طور پر ۱۹۵۱ء ہی میں ''نیو کالج'' کے نام سے عصری علوم کا ایک دارالعلوم وجود میں آیا۔ مدراس ہی کی ایک مقتدر و ممتاز شخصیت جسٹس بشیر احمد سعید (متوفی ۱۹۸۴ء) نے ''ساؤتھ انڈیا ایجوکیشنل ٹرسٹ'' بنا کر S.I.E.T College for Women کی بنیاد ۱۹۵۵ء میں رکھی جس میں آج ہزاروں طالبات زیر تعلیم ہیں۔ تاجران چرم کا مرکز و منبع کہلانے والا شہر ''آمبور'' مظاہر العلوم ڈگری کالج کے لیے مشہور ہے، اے گریڈ کا حامل یہ کالج ''آمبور مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے تحت ۱۹۶۹ء میں منصہ شہود پر جلوہ افروز ہوا۔ علاوہ ازیں ٹمل ناڈو کے ساحلی شہر ''کیل کرائی''، ضلع رام ناتھ پورم میں تین صدیوں پیشتر ایک بزرگ علامہ وقت حضرت مولانا صوفی صدقۃ اللہ اپاّ درس وتدریس اور دعوت و اصلاح میں مشغول رہا کرتے تھے۔ ان کے اسم گرامی کی مناسبت سے وہاں کے دولت مند افراد نے ''صدقۃ اللہ اپاّ ٹرسٹ'' ۱۹۷۱ء میں قائم کیا جس کے ذیل میں کئی کالجس اور ایک یونیورسٹی تشنگان علوم کی سیرابی کے لیے موجود ہیں۔

کیرلا: سرسید کے افکار کی بازگشت ٹمل ناڈو کی پڑوسی ریاست کیرلا میں بھی سنائی دی۔ وہاں کچھ تاخیر سے سہی مسلمانوں نے عصری علوم وفنون کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ مولانا ابوصباح احمد علی ازہری نے ۱۹۴۲ء میں ''روضۃ العلوم عربک کالج'' کی شروعات کی اور انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ایک کمیٹی تشکیل دے کر ۱۹۴۸ء میں کالی کٹ کے قریب ''فاروق کالج'' جاری کیا جسے کیرل کا علی گڑھ کہا جاتا ہے۔ بائیس ایکڑ زمین پر ایستادہ اس کی مختلف شاندار عمارتیں واقعتاً علی گڑھ کی یاد دلاتی ہیں، اسی لیے اس کے داخلی کمان کو وہاں کے اصحاب حل وعقد نے علی گڑھ گیٹ کا نام دے رکھا ہے۔ سرسید کے خیالات سے متاثر ڈاکٹر عبدالغفور نے ۱۹۶۴ء میں ''مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی آف کیرلا'' کی تشکیل کی۔ اس ادارے نے تمام صوبے میں عصری تعلیم کی دانش گاہوں کا جال بچھا دیا۔ ۱۹۹۴ء میں ایم ای ایس انجینئرنگ کالج اور ۲۰۰۳ء ایم ای ایس میڈیکل کالج بھی جاری کیا۔ کیرلا کی ایک اور مشہور ومعروف صاحب علم وفضل شخصیت مولانا اے پی ابوبکر احمد باقوی کانقاپورم کے نام سے متعارف ہے۔ انہوں نے دینی مدارس اور عربک کالج کے ہمدوش عصری علوم وفنون کے جامعات کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۸ء میں قائم شدہ ''مرکز الثقافۃ السنیۃ'' کالی کٹ کے تحت چلنے والے ان تمام تعلیمی مراکز

میں آج پچیس ہزار سے زائد طلبہ فیض یاب ہو رہے ہیں۔(۸)

کرناٹک: صوبہ کرناٹکا کی سرحدیں ٹمل ناڈو سے ملتی ہیں۔وہاں کی تحریکوں کا اثر لامحالہ کرناٹک پر بھی رونما ہوتا ہے۔سرسید کی علمی تحریک کے صالح اثرات کرناٹک کی جن مقتدر شخصیتوں پر ہوئے ان میں نواب غلام احمد کلامی (۱۸۶۷۔۱۹۴۷ء) کا اسم گرامی ممتاز ہے۔ان کے آبا واجداد مدراس پریسیڈنسی میں واقع ریاست رنجن گڈھ (نزد ترچی، ٹمل ناڈو) کے نواب تھے۔میسور مہاراجہ کی طرف سے ان کو ۱۹۴۱ء میں ''قائدالملک'' کا خطاب عطا ہوا۔

کرناٹک میں ان کی علمی و اصلاحی خدمات کی وجہ سے عوام وخواص میں ان کو ''سرسید کرناٹک'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ان پر سرسید کے افکار کا گہرا اثر مرتب ہوا تھا۔وہ سرسید کے ایک عاشق صادق تھے۔سرسید کی تحریروں نے ان کی کایا پلٹ دی تھی جس کا اعتراف انہوں نے ۱۲/ اپریل ۱۹۴۲ء کو میسور کے اس عظیم الشان تہنیتی اجلاس میں کیا جو ان کو ''قائدالملت'' کا خطاب تفویض کی جانے پر منعقد ہوا تھا۔نواب صاحب نے فرمایا:

> ''میری پہلی خوش قسمتی یہ تھی کہ میرے عالم شباب ہی میں باوجود میری ہرطرح کی بے بضاعتی کے مشہور آفاق سرسید احمد خان مرحوم کی تحریرات کا مطالعہ حسنِ اتفاق سے مجھے نصیب ہوا۔ان کے اثرات میرے دل ودماغ پر اب تک حاوی ہیں اور فی الوقت یہی نیک اثرات میری اسلامیت کا باعث ہوئے۔سرسید احمد خان کے مقالات نے ہی مجھے اکتساب علم نافع پر آمادہ کیا اور اسی شوق نے مجھے قرآن وحدیث کے مطالعہ سے بھی مستفید ہونے پر مائل کیا''۔(۹)

ان ہی جذبات کی وجہ سے ان کو ۱۹۰۱ء میں بمقام مدراس انعقاد پذیر ''آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس'' کے ایک سیشن کی صدارت کا زریں موقع فراہم ہوا اور اس کے ٹھیک بیس سال بعد ماہ مئی ۱۹۲۱ء میں ان کی ایما پر ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' بہ مقام بنگلور منعقد ہوئی جس کی صدارت کے فرائض بھی انہوں نے انجام دیے(۱۰)۔پھر اپنے دیرینہ رفیق شفیق الملک خان بہادر محمد عباس خان (متوفی ۱۹۴۸ء) سے مل کر ''سینٹرل مسلم ایسوسی ایشن'' (.C.M.A) ۱۹۰۷ء میں گورنمنٹ رجسٹریشن آکٹ کے تحت قائم فرمایا جس کے زیر نگرانی آج سینکڑوں تعلیمی ورفاہی ادارے بشمول ''عباس خان ڈگری کالج

فاروکیمن'' کامیابی کے ساتھ جاری ہیں۔نواب کلامی کے کئی کارناموں میں سے ''یتیم خانہ اہل اسلام، معسکر بنگلور'' کا قیام ہے جس کی سرپرستی کو شہر کے اہل ثروت اپنے لیے اعزاز تصور کرتے ہیں۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیلو' 'آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کے رکن دوامی، انجمن حمایت اسلام لاہور، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رکن رکین رہے۔اسلامیہ کالج وانمباڑی کے قیام کے سلسلہ میں اپنے محترم دوست سابق وزیر صوبہ مدراس یعقوب حسن سیٹھ (متوفی ۱۹۴۰ء) کے ساتھ مل کر جدوجہد کی۔ان کے عمدہ اور بے مثال کارناموں کے ثبوت کے لیے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی درج ذیل تحریر کافی ہے جو انہوں نے سید عبدالحکیم دسنوی کو لکھی تھی اور اس کا اقتباس ماہنامہ ''معارف'' کے شمارہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

> ''نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے۔قومی کاموں سے ان کو زیادہ انسیت ہے اور اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے،قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر۔ہر سال اپنے ہزاروں روپے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں''......(۱۱)

نواب کلامی خان بہادر محمد عباس خان کے بعد سرسید سے متاثر ہو کر صوبہ کرناٹک میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے والوں میں ''الامین'' تحریک کے روح رواں ڈاکٹر ممتاز احمد خان (ولادت ۶/دسمبر ۱۹۳۵ء) کا نام نامی یقیناً ممتاز ہے۔ڈاکٹر خان صاحب کے والدین دونوں علی گڑھ کے فیض یافتہ تھے۔والد ماجد وائی اسماعیل خان نے وکالت کی سند مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ان پر سرسید کے اثرات نمایاں تھے۔انہوں نے اپنے فرزند کو بھی بچپن ہی سے سرسید کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔اسی لیے ''اسٹینلے میڈیکل کالج'' سے ڈاکٹر کی سند حاصل کرنے کے باوجود انہوں نے تعلیمی خدمات کو ترجیح دی۔قوم کی زبوں حالی کا علاج عمدہ تعلیم اور صحیح تربیت میں ڈھونڈ نکالا۔اسی غرض سے انہوں نے شہر بنگلور میں ۱۹۶۶ء میں ''الامین ایجوکیشنل سوسائٹی'' رجسٹر کروائی جس کی مجلس عاملہ نے ۱۹۶۸-۱۹۶۷ء کے تعلیمی سال میں الامین آرٹس، سائنس اور کامرس کالج کی ابتدا کی جو آج اپنی پرشکوہ عمارتوں اور خوبصورت ماحول کی وجہ سے شہر میں کافی مشہور ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی سرپرستی میں نہ صرف صوبہ کرناٹک میں بلکہ ہندوستان کے دیگر صوبہ جات میں بھی الامین اسکولس، کالجس اور رہائشی انسٹی ٹیوٹ کا

قیام قابل رشک ولائق تحسین ہے۔اس تحریک کا اہم ترین کارنامہ دکن کی عادل شاہی سلطنت کے پایہ تخت ''بیجاپور'' میں ''الامین میڈیکل کالج'' کا افتتاح ہے جو ستمبر ۱۹۸۴ء میں روبہ عمل لایا گیا اور اسے ملک کے اولین مسلم میڈیکل کالج ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔الامین کے بعد ۱۹۸۴ء ہی میں محترم اویسی صاحب کا ''دکن میڈیکل کالج'' حیدرآباد میں منظرعام پر آیا اور پھر ۱۹۹۹ء میں منگلور (کرناٹک) کے اینیوپویا محمد کنہی (Yenopoya Mohammed Kunhi) نے ''اینیوپویا میڈیکل کالج'' شروع کی۔اس کے دوسرے ہی سال ''خواجہ بندہ نواز انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس'' گلبرگہ شریف میں قائم ہوئی۔یہ تمام تعلیمی تسلسل سرسید کی تحریک کا بہترین ثمرہ ہے۔

آندھرا پردیش:　　صوبہ آندھرا پردیش ٹمل ناڈو ہی سے لگا ہوا صوبہ ہے۔وہاں بھی سرسید کے افکار کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔آندھرا پردیش کا ایک ضلع کڈپہ (Kadapa) جو تین صدیوں پیشتر سے نوابوں کا گڑھ رہا ہے، جہاں نواب عبدالنبی خان میانہ (عہد حکومت ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۵۸ھ) نے حکومت کی تھی جس کے دربار سے ''قصیدہ بردہ'' کا اولین دکنی مترجم محمد ابن رضا وابستہ تھا، مسلمانوں کی کثیر آبادی والا یہ شہر اردو کے ماہرین اور فارسی کے عالموں کا مرکز رہا ہے، تاہم جب سرسید کی آواز کا جادو یہاں چلا تو یہاں کی میونسپلٹی کے ذمہ داروں نے ''منسپل مسلم ہائی اسکول'' کے نام سے فوقانی تعلیم کا ادارہ ۱۸۸۵ء میں قائم کیا جس میں انگریزی شعبہ کے علاوہ حساب اور سائنس، انگریزی میڈیم میں اور سوشل اسٹڈیز، تاریخ وجغرافیہ اردو میڈیم میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔اب یہ اسکول منسپل کارپوریشن اردو۔انگلش ہائی اسکول بن گیا ہے۔

آندھرا کا ایک اور تاریخی مقام ضلع کرنول (Karnol) ہے جہاں کی ایک مقتدر و متحرک شخصیت ''سرسید دکن'' کے خطاب سے یاد کی جاتی ہے، وہ ہیں افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کرنولی (ولادت ۱۹۰۰ء وفات ۱۹۵۸ء) جن کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت آندھرا پردیش نے ''ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی'' گذشتہ سال قائم کی۔ڈاکٹر عبدالحق کی خدمات تمام جنوب پر محیط ہیں۔کیرلا کے فاروق کالج کے لیے ان کی مساعی جمیلہ ناقابل فراموش ہیں۔اسی لیے وہاں آج بھی قابل طلبہ کو ڈاکٹر عبدالحق مڈل دیا جاتا ہے۔ان ہی کی جدوجہد کی وجہ سے مدرسہ باقیات صالحات ویلور، دارالعلوم لطیفیہ ویلور، دارالسلام عمرآباد اور جمالیہ عربک کالج مدراس کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے ہوا اور

وہاں افضل العلماء، منشی فاضل اور ادیب فاضل کا نصاب پڑھایا جانے لگا۔ آندھرا کی مشہور دانش گاہ ایس وی یونیورسٹی، تروپتی میں اردو، فارسی اور عربی کے شعبہ کا قیام ۱۹۵۹ء میں ہوا جو ان کی خصوصی توجہات کا مرہون منت ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۳ء میں اسلامیہ عربی وطبی کالج، کرنول میں قائم کیا، جس کا موجودہ نام ڈاکٹر عبدالحق یونانی میڈیکل کالج ہے۔ علاوہ ازیں نواب سی عبدالحکیم کالج میل وشارم اور جمال محمد کالج ترچنا پلی کے قیام وانتظام میں بھی بھرپور تعاون رہا ہے۔(۱۲)

ڈاکٹر صاحب ماہ اپریل ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بنائے گئے۔ اس منصب جلیل پر فائز رہ کر انہوں نے جامعہ کے نظم ونسق میں نہ صرف سدھار اور باقاعدگی پیدا کی جس سے وہاں کے ماحول میں بے حد خوش گوار تبدیلیاں آئیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

> ''کیا اپنے قول اور اپنے ظاہر سے اور کیا اپنے عمل اور اپنے باطن سے لڑکوں اور استادوں، دونوں میں ایک اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی گویا وقارالملک مرحوم کا دور لوٹ آنے لگا اور وہاں وہ اثر چھوڑا کہ کم لوگوں نے اپنی اتنی اچھی اور سچی یادگار علی گڑھ میں چھوڑی ہوگی''۔(۱۳)

پروفیسر رشید احمد کا بیان ہے کہ:

> ''انہوں نے علی گڑھ والوں کے دلوں میں اپنے لیے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات وجذبات پیدا کر لیے جو اتنی کم مدت میں آج تک کوئی پیدا نہ کر سکا''۔(۱۴)

مولانا شاہ معین الدین ندوی کی گواہی ہے کہ:

> ''(آپ) اب سے چند سال پیشتر مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر بھی رہے تھے اور اپنی قابلیت، دینداری اور حسن انتظام سے یونیورسٹی کی فضا بدل دی''۔(۱۵)

ڈاکٹر حق صاحب یقیناً ''جنوب کے سرسید'' کے لقب پانے کے مستحق تھے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کی روح ان کے کارناموں پر نازاں رہی ہوگی۔ پروفیسر سید عابد حسین کا درج ذیل اعتراف ملاحظہ ہو:

> ''مدراس، ملبار اور آندھرا کے لوگوں کی تعلیمی ترقی کے لیے موصوف کی ان تھک کوششیں انہیں جنوب کے سرسید کے لقب کا مستحق بنا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کشتی کو طوفان حوادث سے بچا کر ساحل مراد تک پہچانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (وائس چانسلر) کو جو بیش بہا مدد موصوف سے ملی ہے اس نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے‘‘۔(۱۶)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے سفر نامے ’’جنوبی ہند میں دو ہفتے‘‘ میں تحریر کیا ہے:

’’کرنول میں ایک کالج ہے ’’عثمانیہ کالج‘‘ اس کا قیام مولانا عبدالحق ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ صرف اس کالج ہی پر کیا موقوف ہے جنوبی ہند میں انہوں نے اس طرح تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آج تک ’’جنوبی ہند کے سرسید‘‘ کے نام سے مشہور ہیں‘‘۔(۱۷)

محترمہ صالحہ عابد حسین کے الفاظ ہیں کہ:

’’مدراس میں ڈاکٹر عبدالحق جو ساؤتھ کے سرسید کہلاتے تھے اور علی گڑھ میں پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے اور جن میں اتنا ظرف تھا کہ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے آفر کو رد کر دیا تھا......ساؤتھ میں ڈاکٹر عبدالحق کی بڑی عزت تھی‘‘۔(۱۸)

ڈاکٹر صاحب نے ’’انجمن تعلیمی مسلمانان جنوبی ہند‘‘ کی بھی سرپرستی کی، اس انجمن کے ذریعہ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے ڈاکٹر علامہ اقبال کو خطبات کے لیے دعوت دی تھی۔ اس سے قبل اسی انجمن کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی اور انگریزی مترجم قرآن ’’محمد مارماڈیوک پکتھال‘‘ کے خطبات کا بھی اہتمام کیا تھا۔ اس طرح انہوں نے سرسید کی علمی تحریک کو آگے بڑھایا اور سرسید کے افکار کی معنویت کو جلا بخشی جس سے تمام جنوبی ہند میں تعلیمی انقلاب برپا ہوا۔ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سرسید کی تحریک سے سب سے زیادہ متاثر قطعہ جنوب ہوا اور سرسید کے افکار کا زیادہ فائدہ جنوبی ہند کو حاصل ہوا۔ اسی لیے آج اس کی ہر بڑی آبادی میں مسلمانوں کے اسکول کالج اور درس گاہیں موجود ہیں۔

حیدرآباد: اب آخر میں یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ملک کی آزادی سے پہلے موجود ریاستوں میں سب سے بڑی مسلم ریاست اور سلاطین آصفیہ کے پایہ تخت حیدرآباد (دکن) نے سرسید کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟ اور ان کے افکار کو کس طرح شرف قبولیت بخشا۔ واقعہ یہ ہے کہ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں ’’تہذیب الاخلاق‘‘ کے ذریعہ اپنے آراء وافکار کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا جس کا خاطر خواہ اثر رونما ہوا۔ اس سے تقریباً ربع صدی

پیشتر شہر حیدرآباد میں سلطنت آصفیہ کے زیر سرپرستی ۱۸۴۶ء میں نظام میڈیکل اسکول کا اجراء ہوا پھر ۱۸۵۴ء میں دارالعلوم بعدازاں ۱۸۸۷ء میں نظام کالج، ۱۸۹۹ء میں کالج آف لا اور ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی جاری کیے گئے۔ان تعلیمی سرگرمیوں کے باوجود جب سرسید کی تحریک کی افادیت کا علم ریاست حیدرآباد کے حکمرانوں کو ہوا تو انہوں نے دل کھول کر اس کی تائید کی۔بقول ڈاکٹر داؤد اشرف:

> ''دراصل سرسید ۱۸۹۱ء میں جس وفد کو لے کر حیدرآباد آئے تھے اس وفد میں شبلی بھی شامل تھے۔حیدرآباد میں سرسید اور ان کے وفد میں شریک ارکان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی تھی۔سرسید اور وفد کے ارکان کو نواب میر محبوب علی خان آصف سادس (عہد حکومت ۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء) نے باریابی کا موقع دیا تھا اور اس موقع پر انہوں نے علی گڑھ کی امداد کو دوگنا یعنی دو ہزار کرنے کا حکم دیا تھا۔اس دورۂ حیدرآباد کے موقع پر ایک شان دار جلسہ نواب سی وقارالامراء کی زیر صدارت بیشتر باغ میں منعقد کیا گیا تھا جس میں سرسید اور ان کے بعض رفقا کی تقریروں کے علاوہ مولانا حالی نے اپنا اردو قصیدہ اور علامہ شبلی نے اپنا فارسی قصیدہ پیش کیا تھا''۔(۱۹)

اس کے بعد آصف سابع نواب میر عثمان علی خان نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان اعزازی سکریٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی درخواست مورخہ ۸/جنوری ۱۹۱۶ء پر مذکورہ کانفرنس کے دفتری اخراجات اور مختلف شہروں میں کانفرنس کے انعقاد کے لیے ماہانہ پانچ سو روپے کی خطیر رقم بطور امداد جاری کرنے کا حکم نامہ لسٹ نمبر ۳، سیریل نمبر ۶۰۹ کے توسط سے دیا تھا۔اس امداد کی اطلاع موصول ہونے پر سکریٹری موصوف نے ۸/فروری ۱۹۱۶ء کو بذریعہ ٹیلی گرام نواب صاحب کا شکریہ ادا کیا۔(۲۰)

سرسید کے افکار اور ان کی تحریک کے اثرات ریاست حیدرآباد میں اس وقت تیزی سے پھیلے جب کہ سرسید کے پوتے سر راس مسعود ابن جسٹس سید محمود کا تقرر ۹/ستمبر ۱۹۱۶ء کو بطور ناظم محکمۂ تعلیم، ریاست حیدرآباد ہوا۔راس مسعود کی آمد کے صرف آٹھ ماہ بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور ریاست بھر میں تعلیمی انقلاب برپا ہوا۔اس امر واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے محکمہ آثار قدیمہ حیدرآباد کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر سید داؤد اشرف نے رقم کیا:

> ''سر راس مسعود کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ وہ سرسید احمد خان کے

پوتے تھے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ماہر تعلیم اور علم وحکمت کا سرچشمہ تھے۔ اس سرچشمے سے ریاست حیدرآباد بھی سیراب وفیض یاب ہوئی ہے۔ سرراس مسعود نے ریاست حیدرآباد میں جو تعلیم کے شعبے میں پیچھے اور پس ماندہ تھی اور جہاں خواندگی کا فیصد بہت کم تھا، علم کی روشنی پھیلانے اور تعلیم کو ترقی دینے کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں''۔(۲۱)

بہر حال سرسید کے افکار کا فیض جنوبی ہند کے طول وعرض میں خوب پھیلا اور اس سے عوام و خواص کے ہر طبقہ نے مقدور بھر استفادہ کیا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جنوبی ہند کی آب وہوا میں کیفیت انجذاب وافر مقدار میں بفضلہٖ تعالیٰ پائی جاتی ہے۔

ماخذ وحواشی

(۱) اکبرزاہد، عکس وانمباڑی، مطبوعہ وانمباڑی اردو اکاڈمی، وانمباڑی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۶۔ (۲) روئداد کانفرنس، حصہ دوم، مطبوعہ آگرہ، ۱۹۰۲ء، ص ۳۱۸-۳۲۷۔ (۳) آل احمد سرور، پروفیسر، انتخاب مضامین سرسید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص ۶-۷۔ (۴) ایضاً، ص ۸۔ (۵) ایضاً، ص ۱۱۔ (۶) راہی فدائی، ڈاکٹر، ''مصدقات''، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷۷۔ (۷) عکس وانمباڑی، ص ۳۴، ۳۹۔ (۸) راہی فدائی، ڈاکٹر، قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵۔ (۹) محمد خورشید عالم ندوی، ''فخر کرناٹک شخصیات'' کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۶۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۲۱۔ (۱۱) ایضاً، ص ۱۲۹۔ (۱۲) اقبال احمد، ڈاکٹر، افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق کی تعلیمی اور اردو خدمات، ڈاکٹر ایم عبدالحق ایجوکیشنل اکادمی، کرنول، مطبوعہ جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۷-۱۶۸۔ (۱۳) ایضاً، ص ۱۷۶، بحوالہ صدق جدید، لکھنؤ، ۲۹/جنوری ۱۹۶۵ء۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۷۶، بحوالہ ''ہم نفسان رفتہ'' از رشید احمد صدیقی۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۷۹، بحوالہ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۵۳ء۔ (۱۶) ایضاً، ص ۳۳۲ کے بعد کور پیج پر۔ (۱۷) ایضاً، ص ۹۔ (۱۸) ایضاً، ص ۱۸۱، بحوالہ ''سفر زندگی کے لیے سوز وساز'' از صالح عابد حسین، اکتوبر ۱۹۸۲ء، ص ۳۴۔ (۱۹) داؤد اشرف، سید، ڈاکٹر، بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۰۵ء، ص ۸۶۔ (۲۰) داؤد اشرف، سید، ڈاکٹر، حیدرآباد کی فیض رسانی، شگوفہ پبلی کیشنز، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ص ۵۱-۵۳۔ (۲۱) بیرونی ارباب کمال اور حیدرآباد، ص ۱۵۳۔

اسلام کا طریقۂ طلاق و تحلیل (حلالہ)

پروفیسر مسعود عالم فلاحی

اسلام میں نکاح کی اہمیت: شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ اور پائیدار عمل ہے، نکاح کے ذریعہ سے مقصد خداوندی یہ ہے کہ مرد و عورت کے درمیان ہونے والا یہ رشتۂ نکاح سدا بہار اور خوشگوار رہے، باد خزاں کا کوئی جھونکا اسے نہ لگ سکے اور نہ ہی اختلاف و انتشار کی آلودگی اس رشتہ کی لطافت اور پاکیزگی کو گدلا کر سکے، اور اس کی بقاء کے لیے میاں بیوی کی ذمہ داری ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز کرتے رہیں، اور بہترین ازدواجی زندگی کے لیے ہر ممکن صبر و برداشت کرنے اور قربانی دینے کا جذبہ پیدا کریں۔

طلاق دراصل اسی رشتۂ نکاح کے توڑنے کا نام ہے، اسی لیے اسلام اسے پسند نہیں کرتا، حدیث میں ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے۔(۱)

حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔(۲)

ان سب احادیث کی وجہ سے فقہائے کرام نے بلا شدید ضرورت طلاق کو ناجائز قرار دیا ہے اور شدید ضرورت کی تفسیر بھی بعض احادیث میں وارد ہوئی ہے، جیسے عورت کا بدچلن ہونا وغیرہ۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت بن جاتی ہے اور حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ شاہراہ زندگی پر میاں بیوی کا ساتھ چلنا ممکن نہیں رہتا، ان حالات میں

صدر شعبۂ عربی، خواجہ معین الدین چشتی، اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنو، یوپی۔ موبائل: 91-9559840136

ای میل: masoodfalahi@gmail.com ۔

ایک ضرورت کی چیز سمجھ کر اسلام نے طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔

طلاق کو روکنے کے لیے اسلامی تدبیریں: طلاق کے بارے میں اسلام کی پہلی کوشش یہ ہے کہ اس کا وقوع نہ ہو؛ لیکن اگر شدید ضرورت پیش آ جائے تو پھر دوسری کوشش یہ ہے کہ اختلاف اور نزاع کے پہلے ہی مرحلے میں طلاق نہیں دینی چاہیے، بلکہ ایسی تمام صورتوں کو عمل میں لانا چاہیے جن کے ذریعہ زوجین کے درمیان کی کشیدگی ختم ہو جائے۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے منفی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے مثبت پہلو پر نظر رکھیں، کیونکہ ہر انسان کے اندر اچھائی اور برائی ہوتی ہے، کوئی بھی انسان صرف شر کا یا صرف خیر کا مرکز نہیں ہوتا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔(۳)

ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ بھی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اگر ایسا ممکن ہو جائے تو پھر طلاق کی ضرورت نہیں، اسلام نے طلاق سے قبل کی ابتدائی تدبیروں کا انتہائی جامع نقشہ کھینچا ہے، ارشاد باری ہے:

وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا ۔ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۔(۴)

اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، خواب گاہوں میں ان سے علاحدہ رہو اور مارو، پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو، یقین رکھو کہ اوپر اللہ موجود ہے جو بڑا اور بالاتر ہے اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو، وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا،

اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھانے بجھانے سے کام لینا چاہیے، کیونکہ پیار اور محبت کے دو بول میں جتنی تاثیر ہے اتنی سختی اور مار پیٹ میں نہیں، اگر اس سے کام نہ چلے تو اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے اپنی خواب گاہ اور بستر علاحدہ کرلو، پیار کرنے والی بے لوث بیوی کے لیے اس سے بڑی کوئی سزا نہیں، پھر اگر اس سے کام نہ چلے اور عورت اپنی اصلاح نہ کرسکے تو مناسب انداز میں، اس کی فطری کمزوری کا لحاظ کرتے ہوئے تھوڑی سی سختی کی بھی اجازت ہے، اب اگر عورت اپنی اصلاح کرلے تو شوہر کی ذمہ داری ہے کہ بہترین رفیق زندگی کی طرح ساتھ رہے، ظلم وستم کا کوئی راستہ نہ ڈھونڈ ھے۔

یہ تمام کارروائیاں شوہر کے ذریعہ سے انجام پاتی ہیں، اگر یہ تمام کارروائیاں ناکام ہوجائیں اور ان کے باوجود بیوی کی اصلاح حال نہ ہوسکے، اور وہ بے جا زیادتی پر آمادہ ہو تو ایسی صورت میں اب اجتماعی کارروائی کی ضرورت ہے، اس کی تفصیل مذکورہ دوسری آیت میں کی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اب دوسرے ذمہ دار، معاملہ فہم اور ہمدرد افراد خانہ کے ذریعہ معاملہ حل کرنے کی کوشش کی جائے اور باہمی مصالحت پر زوجین کو آمادہ کیا جائے، اگر یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو دونوں میاں بیوی کی ذمہ داری ہے کہ ازدواجی زندگی میں درآنے والی خرابیوں کو آپسی الفت ومحبت کے ذریعہ ختم کردیں۔

لیکن اگر ثالثی اور پنچوں کی کوشش بھی ناکام ہوجائے اور زوجین کے درمیان کسی بھی حال میں موافقت نہ ہوسکے اور عورت کی طرف سے نافرمانی اور حکم عدولی کا سلسلہ جاری رہے تو اب شریعت شوہر کو طلاق کی اجازت دیتی ہے۔

یہ مذکورہ بالا دونوں آیتوں کا خلاصہ ہے، جو میاں بیوی کے درمیان ہونے والی نااتفاقیوں کو ختم کرنے کا نسخۂ اکسیر ہے اور روئے زمین پر اس سے زیادہ معقول، سریع الاثر کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں۔

اسلامی طریقۂ طلاق: مذکورہ صورتوں میں جب اتفاق اور میل ملاپ کی تمام کوششیں ناکام ہوجائیں تو عورت کی پاکی کی حالت میں (جس میں عورت سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ طلاق کے ذریعہ صرف ایک طلاق دے، اس طلاق کو رجعی کہتے ہیں، اس طلاق میں شوہر کو یہ حق رہتا ہے کہ اگر اسے اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کو اپنی غلطی پر ندامت کا احساس ہو تو عدت گذرنے سے پہلے تک بیوی

کو اپنے نکاح میں لوٹا سکتا ہے، اس کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں ''رجعت'' کہتے ہیں اور اگر وہ علاحدگی کے فیصلے پر قائم ہے تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے سے یہ رشتہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اگر اب بھی شوہر کو پشیمانی ہو اور وہ دونوں بہتر ازدواجی زندگی کی پھر سے شروعات کرنے کا عہد کرتے ہیں تو انہیں شریعت کی طرف سے اس کی اجازت ہے کہ ازسرنو نکاح کرلیں اور اگر اس کے بعد میاں بیوی کے درمیان پھر سے اختلاف پیدا ہو تو اختلاف دور کرنے کی مذکورہ بالا تمام صورتوں پر عمل کریں، اگر وہ تمام ناکام ہو جائیں تو پھر عورت کی پاکی کی حالت میں ایک طلاق دینے کی اجازت ہے، ان دو طلاقوں کے بعد بھی اسے پشیمانی ہے اور وہ دونوں ساتھ مل کر رہنے کا تیسری مرتبہ عہد کرتے ہیں تو بھی عدت کے اندر بیوی کو بغیر نکاح لوٹا سکتا ہے، لیکن اگر عدت ختم ہو جائے اور اس کے بعد انہیں ہوش آیا تو نکاح کرنا پڑے گا، اس نکاح کے بعد پھر دوبارہ نا اتفاقی ہوئی اور مصالحت کی ساری کوششیں ناکام ہو جائیں تو آخری چارہ کے طور پر تیسری طلاق دے سکتا ہے۔

اسلامی طریقۂ طلاق کی مذکورہ تفصیلات سے یہ بات مکمل واضح ہو جاتی ہے کہ طلاق ایک مذاق نہیں، بلکہ انتہائی مجبوری کی حالت میں اور صلح وصفائی کی تمام کوششوں کے باوجود صرف ایک وقت میں ایک طلاق کی اجازت ہے اور ایک سے زیادہ طلاق ایک وقت میں شریعت اسلامیہ کا کھلا ہوا مذاق ہے۔ اسلام کا مقصد چونکہ رشتہ کو باقی رکھنا ہے اس لیے شوہر کو یہ بھی حکم دیا کہ وہ طلاق دینے کے بعد بیوی کو اپنے گھر سے نہ نکالے بلکہ عدت اپنے گھر میں ہی گذارنے دے، ہوسکتا ہے کہ شوہر کو اپنے فیصلہ پر پشیمانی ہو یا عورت کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور دونوں آپس میں صلح کرلیں۔ قرآن نے ان تفصیلات کو چند لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ اللہ نے فرمایا:

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمۡسَاكٌ بِمَعۡرُوفٍ	طلاق دو بار ہے، پھر یا تو سیدھی طرح عورت کو
أَوۡ تَسۡرِيحٌ بِإِحۡسَانٍ وَلاَ يَحِلُّ لَكُمۡ أَنۡ	روک لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت
تَأۡخُذُوۡا مِمَّا آتَيۡتُمُوهُنَّ شَيۡئاً إِلاَّ أَن	کردیا جائے اور رخصت کرتے ہوئے ایسا کرنا
يَخَافَا أَلاَّ يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلاَّ	تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم انہیں
يُقِيمَا حُدُوۡدَ اللهِ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيمَا	دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لے لو۔ البتہ
افۡتَدَتۡ بِهِ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللهِ فَلاَ تَعۡتَدُوۡهَا	یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ زوجین کو اللہ کے حدود پر قائم

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النَّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلاَ تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لَّتَعْتَدُواْ وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلاَ تَتَّخِذُوَاْ آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَاذْكُرُواْ نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ وَاتَّقُواْ اللّٰهَ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْاْ بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكُمْ أَزْكَى لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ۔(۵)

نہ رہ سکنے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہ رہیں گے، تو ان دونوں کے درمیان یہ معاملہ ہو جانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علاحدگی (خلع) حاصل کر لے۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کریں، وہی ظالم ہیں اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے، تو یا بھلے طریقے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو، محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی اور جو ایسا کرے گا، وہ درحقیقت اپنے ہی اوپر ظلم کرے گا، اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ، بھول نہ جاؤ کہ اللہ نے کس نعمت عظمٰی سے تمہیں سرفراز کیا ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ جو کتاب اور حکمت اس نے تم پر نازل کی ہے، اس کا احترام ملحوظ رکھو۔ اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اللہ کو ہر بات کی خبر ہے، جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم مناکحت پر راضی ہوں، تمہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا، اگر تم اللہ اور روز آخر

پر ایمان لانے والے ہو، تمہارے لیے شائستہ اور
پاکیزہ طریقہ یہی ہے کہ اس سے باز رہو، اللہ جانتا
ہے تم نہیں جانتے۔

آیت ۲۳۲ میں جہاں عورت کے رشتہ داروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ طلاق رجعی کی عدت کے بعد اگر عورت دوبارہ نئے نکاح کے ذریعہ معروف یعنی بھلے طریقے سے اپنے سابق شوہر کی طرف لوٹنا چاہے تو تم اسے ایسا کرنے سے نہ روکو، وہیں دوسری طرف سابق شوہر کو حکم دیا جارہا ہے کہ عدت کے بعد اگر عورت کسی اور شخص سے نکاح کرنا چاہے تو اس میں وہ مانع نہ ہو۔

طلاق کا یہ اسلامی اور قرآنی طریقہ ہے، اس میں کہیں بھی تین طلاق ایک ساتھ دینے کی بات نہیں کہی گئی ہے، لیکن سماج میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے ایک ساتھ تین طلاق دیدیتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بغیر تین طلاق دیے ہوئے طلاق واقع ہی نہیں ہوگی، حالانکہ ایک طلاق سے بھی طلاق ہوجاتی ہے اور جدائی اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ ایک ساتھ دی گئی تین طلاق ایک طلاق ہوگی یا تین۔ بہت سے علماء بشمول علمائے اہل حدیث اسے ایک مانتے ہیں تو ائمہ اربعہ اسے تین۔ ان کا اہم استدلال حضرت عمرؓ کے عمل سے ہے جس میں انہوں نے حالات کے مدنظر، فقہ الواقع پر عمل کرتے ہوئے مردوں کو سزا دینے کے لیے مجبوراً تین طلاق کو نافذ کرنے کا حکم دیا تھا۔ احناف بیک وقت دی گئی تین طلاق کو تین تو مانتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اسے طلاق بدعی بھی کہتے ہیں، یعنی ان کے یہاں بھی طلاق کا طریقہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ تو واضح ہے کہ ایک بیٹھک کی تین طلاق قرآنی تعلیمات کا مذاق ہے، جس پر اللہ نے تنبیہ کی ہے، فرمایا:

وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔ (۶) اللہ کی آیات کا کھیل نہ بناؤ۔

نکاح تحلیل (حلالہ): مذکورہ بالا قرآنی طریقۂ طلاق سے تین طلاق دیدی جائے تو وہ طلاق مغلظہ کہلاتی ہے، اس کے بعد شوہر اپنی سابقہ بیوی سے نکاح نہیں کرسکتا ہے، اس کے بعد اگر وہ اپنی بیوی سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے درج ذیل امور کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے:

۱۔ پہلے شوہر کی عدت گزارنے کے بعد وہ عورت اپنی مرضی سے بغیر کسی سازش اور حیلہ کے

دوسرے مرد سے نکاح کرے۔ ۲۔ وہ دوسرا مرد اس عورت کے ساتھ، ہم بستری بھی کرے۔ ۳۔ اس کے بعد وہ مرد اپنی مرضی سے، اس عورت کو طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہوجائے۔ ۴۔ پھر طلاق یا وفات کی عدت گزار لے۔

اس کے بعد وہ بیوی اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہوسکتی ہے، سابق شوہر سے حلال ہونے کی اسی کارروائی کا نام ''نکاح تحلیل (حلالہ)'' ہے۔ قرآن میں اللہ نے اس کی تفصیل اور طریقہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّى تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا إِن ظَنَّا أَن يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ۔(۷)

پھر اگر (دوبار طلاق دینے کے بعد شوہر نے عورت کو تیسری بار) طلاق دے دی، تو وہ عورت پھر اس کے لیے حلال نہ ہوگی، الا یہ کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو اور وہ اسے طلاق دے دے تب اگر پہلا شوہر اور یہ عورت دونوں یہ خیال کریں کہ حدود الٰہی پر قائم رہیں گے، تو ان کے لیے ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جنہیں وہ ان لوگوں کی ہدایت کے لیے واضح کر رہا ہے، جو (اس کی حدوں کو توڑنے کا انجام) جانتے ہیں۔

مروجہ نکاح تحلیل کی شرعی حیثیت: آج کل مسلم معاشرہ میں ایک غلط رسم یہ چل پڑی ہے کہ لوگ اسی نیت سے نکاح کرتے یا کراتے ہیں کہ مباشرت کے بغیر یا مباشرت کے بعد طلاق دے دیں گے اور عورت پھر اپنے سابق شوہر کے لیے حلال ہوجائے گی۔ حلالہ کی مروجہ صورت شریعت کی نگاہ میں انتہائی غلط اور بے ضمیری کی علامت ہے، حدیث میں اسے ''کرائے کا سانڈ تیس مستعار'' کہا گیا ہے اور اس پر لعنتیں بھیجی گئی ہیں۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تجھے کرائے کے سانڈ کی خبر نہ دوں؟ صحابہؓ نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ حلالہ کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے

حلالہ کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ **ألا اخبر کم بالتیس المستعار؟ قالوا: بلی یا رسول اللہ، قال: "هو المُحَلِّلُ۔ لَعَنَ اللهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهُ۔"** (۸)

یہ حدیث راویوں اور لفظوں کے فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں صحیح اسناد کے ساتھ آئی ہے۔ (۹)

اسی وجہ سے صحابہ کرام، تابعین، وتبع تابعین، فقہاء جیسے عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن سلامؓ، ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عائشہؓ، انس بن مالک، سعید بن مسیب، حسن بصری، ابراہیم نخعی، عطا بن ابی رباح، ابوالشعشا جابر بن زید، شعبی، قتادہ، بکر بن عبداللہ مزنی، مالک بن انس اور ان کے اصحاب، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابوعبید القاسم بن سلام، سلیمان بن داؤد ہاشمی، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابواسحاق جوزجانی، اور امام شافعی، امام ابویوسف، امام محمد حنفی وغیرہ کا خیال ہے کہ سازشی حلالہ سے بیوی اپنے سابقہ شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی اور یہ نکاح باطل ہوگا۔ امام احمد تو ایسے نکاح کو متعہ کے مانند کہتے ہیں جو ہر حال میں حرام ہے، عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ سازشی حلالہ کے بعد نکاح کرنے والا مرد اور عورت جب تک ساتھ رہیں گے ہمیشہ حالت زنا میں رہیں گے۔

اگر کوئی شخص عورت اور مرد کو بتائے بغیر ان کی بھلائی کی خاطر عورت سے نکاح کر کے طلاق دے دے تاکہ وہ اپنے سابق شوہر کے لیے حلال ہوجائے، تو ایسی صورت کو بعض علماء اس شرط پر جائز قرار دیتے ہیں کہ میاں بیوی میں سے کسی کو اس شخص کی نیت اور ارادہ کا علم نہ ہو، لیکن بعض علماء کے نزدیک وہ نکاح بھی حرام ہوگا اور وہ اپنے سابق شوہر کے لیے جائز نہ ہوگی، اس سے نکاح اسی صورت میں جائز ہوگا جب کسی نے بغیر کسی سازش کے اپنی اور عورت کی مرضی سے زندگی گزارنے کی خاطر نکاح کیا ہو، لیکن بعد میں کسی وجہ سے ان کے درمیان طلاق ہوجائے۔ (۱۰)

حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے "**لا أوتی بمحل و محلل له الا رجمتهما**" (اگر حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہے وہ میرے پاس لائے جائیں تو میں دونوں کو رجم کردوں گا)۔ (۱۱)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ (۱۲۶۳-۱۳۲۸ء) نے اس موضوع پر ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ایک انتہائی محققانہ کتاب "**بیان الدلیل علی بطلان التحلیل**" لکھی ہے جس میں انہوں نے مدلل طور پر

ثابت کیا ہے کہ ایسا نکاح باطل ہے۔ سارے صحابہ، سلف صالحین نے اسے حرام قرار دیا ہے۔(۱۲)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) کی بھی یہی رائے ہے، وہ لکھتے ہیں:

”احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے لیے حلال کرنے کی خاطر کسی سے سازش کے طور پر اس کا نکاح کرائے اور پہلے سے یہ طے کر لے کہ وہ نکاح کے بعد طلاق دے دے گا، تو یہ سراسر ایک ناجائز فعل ہے۔ ایسا نکاح، نکاح نہ ہوگا، بلکہ محض ایک بدکاری ہوگی اور ایسے سازشی نکاح وطلاق سے عورت ہرگز اپنے شوہر کے لیے حلال نہ ہوگی“۔(۱۳)

تمام صحابہؓ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ ثلاثہ اور احناف کے نزدیک مروجہ یعنی سازشی نکاح تحلیل حرام ہے، صرف امام ابوحنیفہ کے یہاں یہ نکاح کراہت تحریمی کے ساتھ جائز ہے،(۱۴) امام ابوحنیفہ کے یہاں اسے جائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے قرآنی شرط ”حتی تنکح زوجا غیرہ یہاں تک اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کرے“ پوری کر لی، چاہے وہ جائز طریقہ سے پوری کی ہو یا ناجائز طریقہ سے۔ امام ابوحنیفہ اس حلالہ کے ذریعہ ہوئے نکاح کو صرف شرط پوری ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیتے ہیں، ورنہ ان کے یہاں بھی حلالہ کے لئے حیلہ کرنا گناہ اور باعث عذاب ہے اور ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں۔

حیلہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک شرعی جیسے جنگ وغیرہ میں حیلہ کرنا اور دوسرا غیر شرعی جیسے اپنے مقصد کے لیے قرآنی نص اور حکم الٰہی کی تاویل کرنا، دوسروں کو اپنے فایدہ کی خاطر دھوکہ دینے کے لیے حیلہ کرنا۔ قرآن نے دوسرے قسم کے حیلہ کو حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ منافقین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلاَّ أَنفُسَهُم وَمَا يَشْعُرُونَ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ	بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ کو ہی دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں، جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم

مُسْتَهْزِئُونَ اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ (۱۵)

ایمان لائے ہیں اور جب علاحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے محض مذاق کر رہے ہیں۔

اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سنیچر کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے کی ممانعت کی تھی، لیکن جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ اسی دن مچھلیاں آتی ہیں اور دوسرے دنوں میں نہیں آتیں، تو انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ سنیچر کو گڈھا کھود دیتے تھے تا کہ مچھلیاں آ کر اس میں پھنس جائیں اور دوسرے دن ان کا شکار کر لیتے تھے۔ ان میں کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے منع کیا کہ یہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے، لیکن انہوں نے ان کی بات نہیں مانی اور نصیحت کو بھلا دیا۔ اللہ نے نصیحت کرنے والوں کو تو بچا لیا، لیکن ان نافرمانوں کو غیر شرعی حیلہ کے ذریعہ حکم الٰہی کو پامال کرنے کے جرم میں ذلیل بندر بنا دیا۔ (۱۶)

امت کے غیرت مند افراد کی ذمہ داری ہے کہ مروجہ غیر شرعی طلاق وحلالہ کے سلسلہ میں امت میں بیداری مہم چلائیں اور امت کو اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس دلائیں اور اس غلط رسم کے خاتمہ کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ حلالہ کا یہ حرام طریقہ وہ لوگ کرتے ہیں جو قرآنی طریقۂ طلاق کو نہیں اپناتے ہیں اور ایک ساتھ ہی تین طلاق دے دیتے ہیں اور دوسرے مسلک کی کشادگی سے فائدہ نہ اٹھا کر اپنے مسلک پر جمے رہتے ہیں، حالانکہ ائمہ اربعہ نے کہا ہے کہ اگر ان کے اقوال وآراء کے برخلاف قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ مل جائیں تو ان پر عمل کیا جائے اور ان کے اقوال کو نظر انداز کر دیا جائے۔ غیر شرعی طلاق دینے والے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے تین طلاق کو تین مانا ہے، اس لیے وہ بھی اسے تین ہی مانتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فقہ یا ضرورت کے تحت تین طلاق کو تین نافذ کیا تھا اسے تو یہ حضرات مان لیتے ہیں، لیکن سازشی حلالہ کے سلسلہ میں ان کا قول جو اوپر گذرا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اسلامی طریقہ سے طلاق دیں تو پھر کبھی بھی موجودہ مروج حلالہ کا حرام طریقہ اپنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

نوٹ: قرآنی آایات کا ترجمہ مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے ترجمہ قرآن سے لیا گیا ہے۔

حواشی

(۱) النیساپوری، ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری: صحیح مسلم، مشمول فی الکتب الستۃ، باشراف ومراجعۃ: صالح

بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)، ۵۰۔کتاب صفات المنافقین واحکامھم، ۱۶۔باب تحریش الشیطان، بعثہ سرایاہ لفتنۃ الناس وان مع کل انسان قرینا، حدیث: ۲۸۱۳، ص ۱۱۶۸۔ (۲) الترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ: جامع الترمذی، مشمول فی الکتب الستۃ، باشراف ومراجعۃ: صالح بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)، ۱۱۔ابواب الطلاق واللعان عن رسول اللہؐ، ۱۱۔باب ماجاء فی المختلعات، حدیث: ۱۱۸۷، ص ۱۷۶۹۔ (۳) البقرۃ: ۲۱۶ (۴) النساء: ۳۴۔۳۵۔ (۵) البقرہ: ۲۲۹، ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ (۶) ایضاً، ۲۳۱۔ (۷) ایضاً، ۲۳۰۔ (۸) ابن ماجۃ القزوینی، ابوعبداللہ محمد بن یزید الربعی: سنن ابن ماجۃ، مشمول فی الکتب الستۃ، باشراف ومراجعۃ: صالح بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)، ۹۔ابواب النکاح، ۳۳۔باب المحلل والمحلل لہ، حدیث: ۱۹۳۶، ص ۲۵۹۲۔ ۲۵۹۳۔ (۹) جیسے الترمذی (۱۱۱۹، ۱۱۲۰)، وابن ابی شیبہ (۴/ ۲۹۵۔۲۹۶)، والدارمی (۲۲۶۳)، احمد (۱/ ۸۳، ۸۷، ۸۸، ۹۳، ۱۰۷، ۱۲۱، ۱۳۳، ۱۵۰، ۱۵۸، ۴۰۹، ۴۳۰، ۴۵۰۔۴۵۱، ۲/ ۳۲۳) النسائی (۵۱۰۲) عبدالرزاق (۱۰۷۹۳) ابوداؤد (۲۰۷۶)، ابن ماجہ (۱۱۳۴) البزار (۱۴۴۲ کشف الاستار)، وتمام فی الفوائد (۸۱۵) الحاکم، ۲/ ۱۹۸، البیھقی، ۷/ ۲۰۸ دیکھیے: ابن تیمیہ، شیخ الاسلام: بیان الدلیل علی بطلان التحلیل، حققہ وخرج احادیثہ: حمدی عبدالمجید السّلفی، (المکتب الاسلامی)، ص ۲۸۵۔۲۸۹۔ (۱۰) حوالہ سابق، ص ۱۸۔ ۳۴۔ (۱۱) اخرجہ عبدالرزاق فی مصنفہ (۶/ ۲۶۵) حدیث ۱۰۷۷۷، وسعید بن منصور فی سننہ (۲/ ۷۵): کتاب السنن: باب ما جاء فی المحل والمحلل لہ، حدیث (۱۹۹۲، ۱۹۹۳) وذکرہ السیوطی فی الدر المنثور (۱/ ۵۰۷) وعزاہ لابن أبی شیبہ، وعبدالرزاق وابوبکر بن الاثرم فی سننہ والبیھقی۔ قال الحافظ ابن حجر: اخرجہ عبدالرزاق وابن أبی شیبۃ من روایۃ المسیب بن رافع عن قبیصۃ بن جابر عن عمر فذکرہ۔ بحوالہ: الزمخشری، ابوالقاسم محمود بن عمر: الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، تحقیق وتعلیق ودراسۃ: عادل احمد عبد الموجود وعلی محمد معوض، وشارک فی تحقیقہ: فتحی عبدالرحمن احمد حجازی، (مکتبۃ العبیکان، الریاض، ط۔الاولی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸م)، ۱/ ۴۴۹۔۴۵۱، البقرۃ: ۲۳۰۔

https://islamqa.info/ar/222367 (accessed on 31.10.2016)

(۱۲) op.cit، ص ۱۷۔۱۸۔ (۱۳) تفہیم القرآن، (مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، اشاعت: ۲۰۱۵ء)،

بقرہ: ۲۳۰، ۱/۱۷۶-۱۷۷ (۱۴) الزمخشری، ابو القاسم محمود بن عمر: الکشاف ۱،op.cit/ ۴۴۹، البقرۃ: ۲۳۰، عثمانی، محمد تقی: درس ترمذی، ترتیب وتحقیق: رشید اشرف سیفی، (مکتبہ دار العلوم کراچی، طبع جدید، ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء) باب ماجاء فی الحل والمحلل لہ، ۳/ ۳۹۸-۴۰۲-(۱۵) البقرہ: ۸-۹، ۱۴-۱۵-(۱۶) البقرہ: ۱۶۳-۱۶۶-

مصادر ومراجع

۱-القرآن الکریم۔

۲-ابن تیمیہ، شیخ الاسلام: بیان الدلیل علی بطلان التحلیل، حققہ وخرج احادیثہ: حمدی عبدالمجید السّلفی، (المکتب الاسلامی)۔

۳-ابن ماجۃ القزوینی، ابوعبداللہ محمد بن یزید الربعی: سنن ابن ماجۃ، مشمول فی الکتب السۃ، باشراف و مراجعۃ: صالح بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)۔

۴-الترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی بن سورۃ بن موسی: جامع الترمذی، مشمول فی الکتب السۃ باشراف ومراجعۃ: صالح بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)۔

۵-الزمخشری، ابوالقاسم محمود بن عمر: الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل، تحقیق وتعلیق ودراسۃ: عادل احمد عبدالموجود، وعلی محمد معوض، وشارک فی تحقیقہ: فتحی عبدالرحمن احمد حجازی، مکتبۃ العبیکان، الریاض، ط-الاولی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸م۔

۶-عثمانی، محمد تقی: درس ترمذی، ترتیب وتحقیق: رشید اشرف سیفی، (مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید، ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء)

۷-النیساپوری، ابوالحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری: صحیح مسلم، مشمول فی الکتب السۃ، باشراف ومراجعہ: صالح بن عبدالعزیز بن محمد بن ابراہیم آل الشیخ، (الریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، دارالسلام للنشر والتوزیع، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰م)۔

۸-مودودی، سید ابوالاعلی: تفہیم القرآن، (مرکزی مکتبہ اسلامی پبلی شرز، نئ دہلی، اشاعت: ۲۰۱۵ء)

۹- https://islamqa.info/ar

عورت مذاہب عالم میں
ایک تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن[1]

دنیا کے تمام بڑے مذاہب اور جدید مغربی نظریات و خیالات میں سماجی و تاریخی طور پر عورتوں کے بارے میں کیا کچھ کہا گیا اور انہیں کیا مقام و مرتبہ دیا گیا اور پھر قرآن کریم نے انہیں کیا عزت و عفت بخشی۔ اس کا مختصر جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ہندو مت: ہندو مذہب دنیا کے قدیم مذاہب میں شمار ہوتا ہے جو اپنے اندر کئی ہزار سال کی تاریخ و ثقافت رکھتا ہے۔ اس مذہب کی ایک اہم اور قدیم کتاب منوسمرتی ہے، جو ۸۸۰ قبل مسیح ہندو قوم کے لیے لکھی گئی۔ اس کتاب میں ہندو قوم کے معاشرتی و عائلی قوانین مرتب کیے گئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ باپ، شوہر یا دونوں کی وفات کے بعد کوئی عورت اپنے بیٹے سے علاحدہ نہیں رہ سکتی اور نہ اسے کوئی حق حاصل ہے۔ عورت بچپن میں باپ کی مطیع ہوتی ہے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی۔ اگر بیٹے بھی نہ ہوں تو اپنے قریب رشتہ دار کی۔ ہندو عورت کبھی خود مختار زندگی نہیں گزار سکتی۔

عورت اور شودر دونوں کو نردھن یعنی جائداد سے محروم قرار دیا گیا ہے (یجر وید، ادھیا ۸)۔ لڑکی باپ کی جائداد کی وارث نہیں ہوسکتی (اتھر وید کانڈ (۱)، یجر وید ۸/ ۵، منو ۹/ ۱۹۹)۔ اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بیٹی مرحوم باپ کی وارث نہیں ہوسکتی بلکہ متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) وارث ہوتا ہے۔ (منو/ ادھیا ۹)۔

عورت اپنے شوہر سے کبھی علاحدہ نہیں ہوسکتی۔ یعنی خلع نہیں لے سکتی۔ خاوند کیسا ہی ہو،

---

[1] نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ۔

ظالم ہو، بے رحم ہو، دائم المریض ہو لیکن وہ اس سے الگ نہیں رہ سکتی، کیونکہ مذہبی لحاظ سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ نکاح ثانی کی ممانعت ہے، کیونکہ جائداد بلا وجہ دوسروں کے قبضہ میں نہیں جاسکتی۔ (منو، ادھیا۵/۱۵۱)

عورت اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ بچہ دے، اس کی پرورش کرے اور امور خانہ داری انجام دے (منوشاستر، باب ۹/ ۲۷)۔ عورت مذہبی تعلیم حاصل نہیں کرسکتی، کیونکہ اس کی ممانعت ہے (منوشاستر، ۹/ ۱۸)۔ مرد اور عورت دونوں کے لیے نجات کے الگ الگ راستے ہیں۔ مرد اپنے زور بازو سے مکتی مارگ (راہ نجات) حاصل کرسکتا ہے، مگر عورت کی نجات خاوند پر مر مٹنے ہی سے ہوسکتی ہے۔ وہ براہ راست خدا سے نجات حاصل نہیں کرسکتی (منو، ۲/ ۶۶، ۵/ ۵۵، ۹/ ۱۸)۔ عورت اور شودر کو پاپ یونی (گناہ کا ذریعہ) قرار دیا گیا ہے (گیتا، ادھیا، ۹، اشلوک ۳۲)۔ اگر شوہر بدچلن ہو، اوصاف حمیدہ سے خالی ہو، عیاش ہو، تب بھی بیوی کو چاہیے کہ وہ دیوتا کی طرح اس کی پرستش کرے، جو بیوی شوہر کے فرائض پوری طرح ادا نہ کرے وہ مرنے کے بعد رسوا ہوگی اور گیدڑ کے پیٹ میں جنم لے گی۔ عورت کا نہ کوئی یگیہ ہے، نہ عبادت، نہ برت۔ خاوند کا سیوا کرنا ہی اس کا پریم دھرم ہے (منو، ۵/ ۱۵۵)۔ حیض والی عورت کا پکایا ہوا یا چھوا ہوا کھانا نہ کھایا جائے (منو، ۴/ ۲۱۴)۔

عورت کسی معاملہ میں خود مختار نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے شوہر کے مرجانے کے بعد مرجانا اور اس کی چتا پر چڑھ جانا ضروری ہے۔ ہندوؤں کے ایک قانون کے مطابق تقدیر، طوفان، موت، زہر اور زہریلے سانپ اتنے خراب اور برے نہیں ہیں جتنی کہ عورت بری ہے۔

ہندوؤں میں مذہبی عصمت فروشی کو فروغ حاصل ہوا۔ مندروں میں سینکڑوں دیوداسیاں پروہتوں اور یاتریوں کی جنسی تسکین کا ذریعہ ہوتی تھیں۔ پروہتوں نے لوگوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ جو شخص اپنی بیٹی کو دیوتا کے لیے بھینٹ کرے گا سورگ میں جائے گا۔ (روایات تمدن قدیم، ص ۲۲۸)

شوہر کے مرنے کے ساتھ ہی عورت کے سامنے دو راستے رکھے جاتے، وہ یہ کہ یا تو وہ اپنے شوہر کی چتا پر جل جائے اور ستی ہوجائے یا ساری عمر پریشانی اور ذلت و رسوائی کی زندگی گزارے، کیونکہ بیوہ کو میلے کچیلے کپڑے پہننا پڑتا، روکھا سوکھا کھانا ملتا، وہ صاف ستھرا اور رنگین کپڑا نہیں پہن سکتی۔ لوگ اس کے سائے کو منحوس سمجھتے۔ اس کا سر منڈوایا جاتا۔ وہ اپنی نحوست کی وجہ سے کسی خوشی کی

تقریب میں شریک نہیں ہوسکتی تھی۔اسی لیے ان مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ ستی کے راستے کو ترجیح دیتی تھی۔ برہمنی دور کی ستی ایک ظالمانہ رسم تھی، جس کے بارے میں ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ برہمن گائے کی دم کا بال بیکا نہیں کرتے لیکن ایک جیتے جاگتے انسان کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ برہمن، عورت کو ستی کی ترغیب اس لیے دیتے تھے کہ اس کے جل کر مرجانے کے بعد اس کے زیورات اور متروکہ سامان ان کو مل جاتا تھا۔بعض اوقات نوجوان بیواؤں کو ان کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر چتا پر لے جاتے تھے۔ جہاں انہیں رسّیوں میں جکڑ دیا جاتا کہ مبادا وہ آگ سے گھبرا کر بھاگ نہ جائے، جو عورت بھاگ کر نکل جانے میں کامیاب ہوجاتی تو لوگ اس کو اپنی برادری سے خارج کردیتے۔(روایات تمدن قدیم، ص ۲۳۶)

انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار نے ہندوؤں کے افکار و نظریات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عورت کبھی آزاد نہیں ہوسکتی۔ وہ میراث میں حصہ نہیں پاسکتی۔شوہر کی وفات کے بعد اسے اپنے سب سے بڑے لڑکے کے ماتحت زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ (Encyclopadia of Religion and Ethics, Vol.V, P271)

چانکیہ نے منوسمرتی کو حشو وزوائد سے پاک کیا اور ایک عرصہ دراز تک اس کی تعلیمات دستور العمل کے طور پر رائج رہیں۔اس کے ضابطہ اخلاق میں لکھا ہے: دریا، سینگ والے جانور، بادشاہ اور عورت ناقابل اعتبار ہیں۔اس کے علاوہ سات عیوب عورتوں میں جبلی طور پر پائے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں: جھوٹ، فریب، بے وفائی، طمع ولالچ، ناپاکی، بے رحمی اور بے سوچے سمجھے کام کرنا۔کہا جاتا تھا آگ، پانی، سانپ اور عورت چاروں موجب ہلاکت ہیں۔(منو، ۴۵)

یہودیت: یہود حضرت موسیٰؑ کی قوم ہے۔اس قوم نے بیٹیوں کا درجہ بیٹوں کے مقابلہ میں نہایت پست کردیا تھا، بلکہ نوکر چاکر کا درجہ دیا تھا۔ بھائیوں کی موجودگی میں وہ وراثت سے محروم رہتی تھی۔باپ اپنی بیٹی کو فروخت کرنے کا پورا حق رکھتا تھا۔ان کا خیال تھا کہ حوّاؑ شیطان کا آلہ کار بنی تھیں، جس کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلنا پڑا اور پھر تمام بنی آدم دنیا میں پریشانی میں مبتلا۔اس لیے وہ ازلی گنہگار تھیں۔اسی بنا پر وہ تمام عورتوں کو گناہ اور غلطیوں کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ یہودیوں کے خیال میں عورت شیطان کی سواری اور وہ بچھو ہے جو ہمیشہ ہر انسان کو ڈنک مارنے کی فکر میں رہتی ہے۔

عورتوں کے بارے میں ان کے یہ افکار وخیالات ان کا عقیدہ بن چکے تھے۔ وہ عورتوں کو اس قدر حقیر و ذلیل سمجھتے کہ وہ اپنی مجلسوں میں اکثر سوال کرتے تھے کہ کیا عورتوں کو بھی مردوں کی طرح خدا کی عبادت کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیا وہ بھی جنت میں داخل ہو سکتی ہیں۔ کیا عورت میں انسان کی ابدی روح پائی جاتی ہے۔ یہ سوالات آگے بڑھ کر ان کا مستحکم عقیدہ بن گئے تھے۔

جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ معصیت اول چونکہ بیوی ہی کی تحریک پر سرزد ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کو شوہر کا محکوم رکھا گیا۔ شوہر اس کا مالک و حاکم ہوتا ہے اور وہ اس کی مملوکہ۔ (مسلم پرسنل لا اور اسلام کا عائلی نظام، ص ۱۸۸)

عیسائیت: بائبل عیسائیوں کی مقدس کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حوّا کو شیطان نے بہکایا اور حوّا نے آدمؑ کو بہکایا (پیدائش: باب سوم)۔ اس بنا پر عیسائی مذہب میں عورت کو ابدی گنہگار اور بدی کی بنیاد قرار دیا گیا۔ اسے شیطان کا آلہ کار دوزخ کا دروازہ اور تمام مصائب کا محرک کہا گیا ہے۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی ایک معروف کتاب **المرأة بين الفقه و القانون** ہے۔ اس میں انہوں نے عورت کے بارے میں عیسائیت کے ایک ممتاز عالم ترتولیون (Tartulion) کا نظریہ پیش کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے کہ عورت شیطان کا دروازہ و شجر ممنوعہ کی طرف لے جانے والی، خدائی قانون کو توڑنے والی، خدا کے خلاف اکسانے والی، مرد کو برباد کرنے والی ہے۔ (ص ۲۰)

یوحنا کا قول ہے کہ ”عورت دنیا کے تمام خطرناک درندوں سے زیادہ خطرناک درندہ ہے، میں اپنے مشاہدات کی بنا پر کہتا ہوں کہ شیر کے حملوں سے جتنے آدمی مرتے ہیں اور سانپ کے کاٹنے سے جتنے ہلاک ہوتے ہیں۔ بچھو کے ڈنک زنی سے جتنے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد عورتوں کی فتنہ انگیزیوں سے نہایت کم ہے، جن کے مکروفریب اور دغابازی سے لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم جتنی نفرت شیر اور بچھو سے کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ عورت سے کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ ایذا رساں ہوتی ہے“۔

ایک معروف عیسائی عالم ”قدیس جرنا“ کا ایک خطبہ نقل کیا گیا ہے جس میں اس نے عورت کے بارے میں کہا ”عورت امن کی دشمن ہے۔ وہ اس بچھو کی مانند ہے جو ہر وقت نیش زنی کے لیے تیار رہتا ہے۔ تم اس کے ساتھ کتنی ہی محبت کرو لیکن وہ اپنی فطری شرارتوں سے باز نہیں آسکتا۔ سوچو

کہ ہمارے تمہارے باپ حضرت آدمؑ کس قدر عیش وآرام میں تھے، آرام وسکون کی زندگی گزار رہے تھے لیکن ایک عورت ہی نے ان کو اس دولت سے محروم کر دیا اور تکلیفوں والی زندگی میں پہنچا دیا۔ یہ بات ہمیں خود خدا نے بتائی ہے کہ ہم اس سے دور رہیں اور اس کی نیش زنی سے پرہیز کریں۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ عورت ایسا جادو ہے جس سے شیطان ہماری روحوں پر قبضہ کر لیتا ہے اور ہماری نیک قوتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ اگر ہم عورتوں کو شیطانی جاسوس کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ محض عورت کی وجہ سے شیطان نے دنیا پر غلبہ حاصل کیا اور دنیا کو گمراہ کیا۔ اگر عورت نہ ہوتی تو دنیا امن وسکون کا مرکز ہوتی اور اس کے رہنے والے لازوال مسرتوں سے ہم کنار ہوتے۔ (تاریخ رومۃ الکبری، ۱/ ۱۴۴)

ان افکار وخیالات کا اثر یہ تھا کہ ۱۷۵ء میں رومۃ الکبریٰ میں جو سب سے زیادہ محترم روحانی مرکز تھا، عورتوں کا مقام ومرتبہ لونڈیوں سے بدتر تھا۔ ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ عیسائیت کے تمام حکماء اور فلاسفر اس بات پر متفق تھے کہ عورت فتنہ وفساد کی جڑ ہے۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق، ص ۳۴۳)

عورت معروف قدیم تہذیب میں: اب یہاں دنیا کے چند قدیم ممالک کی تہذیب کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی تاریخ اب تک محفوظ ہے۔ ان کی تہذیبی تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں کے عوام وخواص نے عورتوں کو کیا مقام ومرتبہ دیا اور کس نظر سے انہیں دیکھا۔

یونانی تہذیب: یونانی تہذیب (Greec Civilization) کئی ہزار سال پرانی ہے جو نہایت اہمیت کی حامل ہے اور مثالی کہی جاتی ہے۔ تاہم یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ابتدائی دور میں عورت قانونی، معاشی اور اخلاقی لحاظ سے اپنے حقوق سے محروم تھی۔ اسے کسی طرح کوئی آزادی نصیب نہیں تھی۔ اسے ایسے گھر میں رکھا جاتا جس کی کھڑکیاں کم سے کم ہوں اور راستے سے دور ہوں۔ یونان کی اس قدیم تہذیب میں باپ گھر کا ذمہ دار ہوتا اور اسے یہ حق حاصل تھا کہ وہ بیٹی کو فروخت کر دے۔ باپ نہ ہو تو اس کے بیٹے کو حق حاصل تھا کہ اپنی بہن کو فروخت کر دے۔ باپ کی وفات کے بعد صرف بیٹوں کو وراثت کا حصہ ملتا تھا۔ عورت اس سے محروم تھی۔ عورت ایک اثاثہ تھی جو خرید و فروخت کی جا سکتی تھی، لیکن سماجی طور پر اس کو کوئی حق حاصل نہیں تھا یونان کا قدیم معروف فلاسفر ارسطو

(۳۲۲ق م۔ ۳۸۴ق م) عورتوں کی آزادی کا مخالف تھا۔اس نے اہل اسپارٹا پر اعتراض کیا کہ انہوں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو آزادی یعنی طلاق، وراثت کے حقوق دے رکھے ہیں،جس کی وجہ سے انہیں سماج میں بلند رتبہ حاصل ہوگیا ہے۔اس نے اس خاندان کے زوال کی ایک بڑی وجہ اس آزادی کو قرار دیا۔(المرأۃ فی القرآن،ص ۳۷و ۴۷)

یونان کا دوسرا مشہور فلاسفر سقراط ہے۔اس نے کہا تھا کہ عورت سے زیادہ فتنہ پرور دنیا میں کوئی چیز نہیں۔وہ دفلی کا درخت ہے کہ بظاہر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے لیکن چڑیا اگر اسے کھالے تو مرجاتی ہے۔اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا ”میں نے جس مسئلہ پر غور کیا،اس کی گہرائی کو بہ آسانی سمجھ گیا لیکن میں آج تک عورت کی فطرت کو کماحقہ سمجھ نہ سکا۔میں نہیں جانتا کہ عورت فتنہ انگیزی کی کس قدر بے پناہ طاقت رکھتی ہے۔اگر دنیا میں عورت کا وجود نہیں ہوتا تو دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جاتی۔اس نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ وہ حتی الامکان عورت کی سحر کاریوں اور فتنہ پردازیوں سے محفوظ رہیں اور اس کے جذبات کا احترام نہ کریں ورنہ وہ اپنے مکروفریب میں کامیاب ہوجائے گی“۔(مسلمان میاں بیوی کے حقوق وفرائض،ص ۵۔۶)

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (Encyclopadia of Bratinica) میں لکھا ہے کہ قدیم یونانی تہذیب میں عورت کا مقام اتنا گر گیا تھا کہ اس کی حیثیت بچے پالنے والی لونڈی کی ہوگئی تھی۔ عورتوں کو ان کے گھروں میں قید کردیا جاتا تھا۔وہ تعلیم سے محروم تھیں۔شوہر گھریلو سامان کی طرح ان کا استعمال کرتا تھا۔(ص ۸۴، ۱۹۸۳ء)

رومن تہذیب: رومن تہذیب میں عورت ہر طرح کے سماجی حقوق سے محروم تھی۔عورت کو گھریلو یا باہری زندگی میں کسی لائق نہیں سمجھا گیا۔اس کی گواہی معتبر نہیں تھی۔وہ انسانی جماعت سے ایک الگ مخلوق تصور کی جاتی تھی۔لوگ اس کو جانور سمجھتے تھے اور اسی جیسا سلوک کرتے تھے۔سب سے بڑی ظلم کی بات یہ تھی کہ رومیوں نے عورت کی عملی زبان بندی کے لیے ان کے منہ پر تالا ڈال دیا تھا،جس کو وہ ”موزیسیر“ کہتے تھے۔(تاریخ اخلاق یورپ،ص ۴۱۵)

ایرانی تہذیب: زمانہ قدیم یعنی ماقبل اسلام میں ایرانی حکومت دنیا کی بڑی طاقت شمار ہوتی تھی۔اس کی مخصوص تہذیب تھی لیکن عورتوں کے بارے میں وہاں کے لوگوں کے بھی خیالات اچھے

نہیں تھے۔ وہ عورت کو باندی سمجھتے اور اسی جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے لیے کسی رشتہ کا استثنا نہیں تھا بلکہ جس عورت سے چاہتے تھے شادی کر لیتے تھے۔ علامہ شہرستانی نے لکھا ہے کہ مزدک نے اپنی عورتوں کو تمام لوگوں کے لیے حلال قرار دے دیا تھا، جس طرح آگ پانی اور چارہ سب کے لیے جائز تھا (کتاب الملل والنحل، ص ۸۶)۔ عورتوں کو ان کے تمام حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ عورت کا وجود شرم وحیا کا باعث ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ خدا نے عورت کو پیدا کر کے مخلوق پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ایرانی تہذیب میں ہم جنسی کی وبا عام تھی، جس کی وجہ سے لوگوں میں عورت سے شادی بیاہ کی رغبت کم پائی جاتی تھی۔ ان کو جانوروں سے زیادہ حقیر و ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق، ص ۳۱۶)

انگلستانی تہذیب: دور حاضر میں انگلستان گرچہ ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو آزادئ نسواں کا علم بردار کہتا ہے لیکن اس کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چھٹی صدی عیسوی میں جہالت کا مرکز تھا۔ جہاں عورت کا نہ کوئی مقام تھا اور نہ کوئی عزت تھی۔ کمزور اور بدصورت عورت کو جان سے مار ڈالتے تھے۔ وہ عورت کو باندی کی طرح سمجھتے اور اسی جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ ایک بدنما داغ تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے شوہر، اپنے سرپرست اور پادری کی غلامی کرے۔

اکثر بڑے پادریوں کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر چڑھنے کی اصل وجہ حضرت حوّا کا گندم کھانا تھا۔ اس لیے وہ عورت سے نفرت کرتے اور اس کو ذلیل ورسوا کرتے تھے۔

چھٹی صدی عیسوی کے معروف فلاسفر تھامس ہارڈنگ نے کہا ''عورت ایک خوفناک اژدہے کی مانند ہے، جس کا مقابلہ سہل نہیں ہے۔ اگر ہم دسیوں برس تک غور کرتے رہیں، تب بھی اس کی عیاریاں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عورت ایک شیطانی جادو ہے، جس سے بچنا نہایت دشوار ہے۔ وہ ایک ایسے پھول کی مانند ہے جو ظاہری طور پر خوبصورت نظر آتا ہے لیکن اس میں بے شمار کانٹے پنہاں ہیں''۔ (ترجمہ ہسٹری آف دی ورلڈ، ص ۲۲۱)

زمانہ جاہلیت عرب کی تہذیب: اسلام سے قبل عربوں کی زندگی معاشرتی وتمدنی لحاظ سے نہایت پس ماندہ اور غیر اخلاقی اور انسانیت سے گری ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے اس دور کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں عورت نہایت نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ وہ صرف مرد کی جنسی

جذبات وخیالات کی تکمیل کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔عمر فروخ جو دور جدید کا معروف مورخ وادیب ہے۔ اس نے زمانہ جاہلیت پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس نے تحریر کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی تھی، کیونکہ لڑکے میدان جنگ میں جاتے اور اپنے قبیلے کی طرف سے لڑتے اور مدافعت کرتے تھے۔لڑکے جنگ جیت کر آتے تو پورے خاندان کی ناموری اور بہادری کا ذریعہ ہوتے تھے، جبکہ لڑکیاں ایسا کرنے سے فطری طور پر مجبور تھیں۔اس لیے وہ سماج کے لیے بوجھ سمجھی جاتی تھیں اور وراثت سے محروم کی جاتی تھیں۔(تاریخ الجاہلیۃ،ص ۱۵۷۔۱۵۸)

ڈاکٹر گستاؤلی بان (Gustave Le Ban) نے تصنیف تمدن عرب میں لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں انسان اور حیوان کے درمیان ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھی۔جس کا مقصد صرف بچہ پیدا کرنا اور مردوں کی خدمت کرنا تھا۔لڑکیوں کی پیدائش بدنصیبی خیال کی جاتی تھی اور انہیں زندہ دفن کردینے کی رسم بہت عام تھی۔(تمدن عرب ترجمہ سید علی بلگرامی، ص ص ۴۷۳)

زمانہ جاہلیت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مہم سب سے پہلے بنو اسد کے امراء میں شروع ہوئی اور اس کے بعد بنو ربیعہ اور بنو کندہ اور بنو تمیم کے خوش حال طبقہ نے اس کو اپنایا، پھر یہ رسم خواص سے نکل کر عوام میں داخل ہوگئی۔ یہاں تک کہ یہ ہر طبقہ میں بہت عام ہوگئی اور ہر طبقہ کے لوگوں میں جب لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو زندہ دفن کردیتے۔سب سے پہلا شخص جس نے اپنی بیٹی کو دفن کیا تھا وہ قیس بن عامر تھا۔ چنانچہ جب انہوں نے اسلام قبول کرلیا تو دربار نبوی میں حاضر ہوکر اعتراف کیا کہ انہوں نے زمانہ جاہلیت میں بارہ یا تیرہ بیٹیوں کو زندہ دفن کیا تھا۔(اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ۴۳۳/۲)

بچیوں کو زندہ دفن کردینے کے سلسلے میں عربوں کے مختلف خیالات تھے۔بعض قبائل کا خیال تھا کہ لڑکی بڑی ہوگی تو اس کی شادی کرنی ہوگی، داماد آئے گا، یہ شرم کی بات ہوگی اس لیے اس کو زندہ دفن کردینا بہتر ہے۔بعض لوگ وہ تھے جو نیلی آنکھوں والی یا کالے رنگ والی یا سفید داغ والی یا لنگڑی بچیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔ کیونکہ ایسی بچیوں کو وہ منحوس خیال کرتے تھے، بعض قبائل وہ تھے جو اپنی غربت وافلاس کی وجہ سے بچیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے۔ یہ رسم غریب طبقہ میں بہت عام تھی۔ (بلوغ الارب فی احوال العرب، محمود شکری آلوسی،ص ۵۲۶/۳)

عورت جدید مغربی تہذیب میں (مختصر تاریخ): سطور بالا سے ظاہر ہے کہ دنیا کے مختلف مذاہب اور تہذیبوں نے عورت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ کسی نے اس کو کوئی اچھا مقام و مرتبہ دیا۔ یہ حالات سینکڑوں سال سے چل رہے تھے، جن میں عورتوں پر ظلم و زیادتی جاری تھی۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ان کے خلاف جدید یورپ کی کچھ خواتین میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا جنہوں نے دنیا کی تمام عورتوں کے لیے ایک نیا راستہ پیش کیا، جو آگے چل کر تحریک آزادیٔ نسواں کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ تحریک کب اور کیسے وجود میں آئی، اس کے کیا مطالبات تھے اور اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کی مختصر روداد یہاں پیش کی جاتی ہے۔

مرد و زن کی مساوات: یورپ میں سب سے پہلے مرد و عورت کی مساوات کا نظریہ میری وولس ٹون کرافٹ (Mary Wollstone Craft) نے اپنی کتاب Vindication of the Rights of Women (حقوق نسواں) میں ۱۷۹۲ء میں پیش کیا، جس میں اس نے مطالبہ کیا کہ تعلیم، روزگار اور سیاست کے میدان میں عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کی جائے جو مردوں کو حاصل ہے اور دونوں صنفوں کے لیے اخلاقی معیار بھی یکساں ہونا چاہیے۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے:

> "Women should receive the same treatment as men in education, work oppartunities and politics and that the same moral standards should be applied to the both Sexes".

آگے چل کر جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill) اور کچھ دوسرے ہم خیال لوگوں نے مرد و عورت کی مساوات کے حق میں لکھنا اور دلائل پیش کرنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی یہ آواز ایک نئی تحریک کی صورت اختیار کر گئی اور بہت تیزی سے یورپ میں پھیل گئی۔ اس تحریک میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مرد و عورت کی برابری کا دعویٰ پیش کیا گیا جو بظاہر اچھا اور دلفریب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عورتوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ اپنا حق سمجھ کر اس تحریک کے ساتھ شامل ہوگئیں۔ بہت سارے مردوں نے جو عورتوں کی بے پردگی، برہنگی اور عریانیت کو زیادہ پسند کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی اس کی پُرزور تائید و حمایت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک ایک ترقی پسندانہ نعرے کی حیثیت اختیار کر گئی جس کے خلاف کچھ کہنا ترقی پسندی کے خلاف جرم سمجھا جانے لگا۔ (اسلام اور نظریہ مساوات

مردوزن ازمحمد رفیق چودھری، ص ۱۷، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۰ء)

امریکہ میں حقوق نسواں کی تحریک: امریکہ میں حقوق نسواں کی تحریک مختلف ادوار سے گزری۔ آخری دور کی تحریک بیسویں صدی میں شروع ہوئی، جو اب تک چل رہی ہے۔ یہ تحریک Current women'srightsmovement کے نام سے موسوم ہے۔

امریکی عورتیں پہلے عام طور پر گھروں میں زندگی گزارتیں اور گھریلو کام کاج کرتی تھیں لیکن حقوق نسواں کی تحریک نے ان کی زندگیوں پر اثر ڈالا۔ امریکہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں گھریلو کام کاج کے بجائے وہاں کے کارخانوں اور دفتروں میں کام کرنا شروع کردیا۔ پھر ایک کنونشن ملک گیر پیمانے پر نیو یارک کے قریب شہر SenecaFalls میں منعقد ہوا تو وہاں کی عورتوں کی زندگی پر اس کا غیر معمولی اثر پڑا۔ عورتوں میں کافی بیداری پیدا ہوئی، کیونکہ یہ کنونشن ایک انقلابی عنوان سے بلایا گیا تھا۔ عنوان تھا Declaration of Sentiments یعنی جذبات کا منشور۔ یہی منشور امریکی خواتین کی تمام زندگیوں پر اثر انداز ہوا۔ سیاسی، سماجی اور گھریلو زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ یہ منشور بڑا جذباتی اور دلفریب تھا۔ اس منشور کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ”خالق نے مرد و عورت کو یکساں طور پر پیدا کیا ہے اور دونوں کو بنیادی حقوق عطا کیے ہیں، جن میں حفظ جان، آزادی اور حصول مسرت کے حقوق شامل ہیں۔ ان ہی حقوق کے تحفظ کے لیے حکومتیں بنائی جاتی ہیں جو عوام کی مرضی سے وجود میں آتی ہیں۔ اگر کوئی حکومت قوم کی بنیادی حقوق کا تحفظ نہیں کرسکتی تو اس کو اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔
>
> موجودہ حکومت کے دور میں عورت بہت مظلوم ہے۔ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ظلم وستم کا شکار رہی ہے۔ آج بھی عورت کی حالت یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام سیاست میں اس کی کوئی آواز اور اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اسے عوامی نمایندگی کا حق حاصل نہیں ہے۔ مرد اپنی مرضی سے حکومت کے اختیارات استعمال کرکے عورتوں کے خلاف قانونی کارروائی کرتے ہیں۔ ملک کے جاہل اور گنوار مردوں کو وہ حقوق حاصل ہیں جن سے عورتیں بالکلیہ محروم ہیں۔ معاشرے میں ہر شادی شدہ عورت زندہ درگور ہے۔ اسے ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ جو کچھ کماتی ہے وہ بھی اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کی کمائی کا مالک بھی

مرد ہوتا ہے۔ تمام اچھی ملازمتوں میں مردوں کی اجارہ داری ہے۔ عورتوں کو مردوں سے کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ دولت، عزت، حیثیت کے تمام مقام اور مواقع صرف مردوں کو حاصل ہیں۔

عورت اور مرد کے اخلاق کے لیے دوہرا معیار رکھا گیا ہے۔ کسی بھی اخلاقی برائی کی صورت میں مرد سے زیادہ عورت کو بدنام کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں عورتوں کی صلاحیتیں تباہ کی جاتی رہی ہیں اور ان کی خود اعتمادی چھین لی گئی ہے۔ اس کی عزت نفس کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ ذلت و محکومیت اس کا مقدر بن چکا ہے۔ اس ملک میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں مذہبی و معاشرتی طور پر ذلیل وخوار کیا گیا ہے۔ ہم مظلوم ہیں، ہمارا استحصال ہورہا ہے، اب ہمارا مطالبہ ہے کہ ہمیں امریکہ کے شہر کے مردوں کے برابر اور مساوی حیثیت دی جائے"۔

حقوق نسواں کا منشور اور اس کے نتائج وفوائد: امریکی خواتین نے اپنی آزادی کے لیے جو منشور منظور کیا اور انھوں نے جو کوششیں کیں، ان سے انہیں پورا فائدہ حاصل ہوا۔ حکومت نے انہیں شہری حقوق دیے۔ ان کی ملکیت کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ سیاسی میدان میں عملی طور پر وہ حقدار ہوگئیں۔ بہت ساری ملازمتوں میں مردوں کے برابر ان کو تنخواہیں ملنے لگیں۔ مرد وعورت دونوں کے لیے یکساں قوانین بن گئے۔ دونوں کا اخلاقی معیار ایک طرح ہوگیا۔

حقوق نسواں کی عالمی کانفرنس: یورپ اور امریکہ کے بعد اقوام متحدہ نے بھی حقوق نسواں اور ان کی آزادی کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ۱۴/ ۱۵ ستمبر ۱۹۹۵ء کو بیجنگ میں ایک عالمی کانفرنس عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں منعقد کی گئی۔ اس سے قبل علاقائی کانفرنسیں انڈونیشیا، ارجنٹینا، آسٹریلیا، اردن اور سینگال میں منعقد کی گئیں تاکہ عورتوں کے مختلف مسائل پر گفتگو ہوسکے اور تمام عورتیں اپنے تمام مسائل کو لے کر اقوام متحدہ کی کانفرنس میں شریک ہوں۔ اس کے علاوہ تین عالمی کانفرنسیں ہوئیں۔ پہلی میکسیکو (امریکہ) میں ۱۹۷۵ء میں، دوسری ۱۹۸۰ء میں ڈنمارک میں اور تیسری ۱۹۸۵ء میں نیروبی میں۔

ان تینوں کا بنیادی مقصد مرد وعورت کی مساوات اور امن عالم کا قیام تھا۔ اب جو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بیجنگ میں کانفرنس ہوئی، اس میں دنیا بھر کے ۱۸۰ ممالک کے تقریباً تین ہزار مندوبین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کے انعقاد پر آٹھ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ شرکاء کی تعداد ستر ہزار

تھی۔ ایک سو ستر صفحات میں اس کی دستاویز تیار ہوئی، جس میں بنیادی طور پر مرد و زن کے درمیان تعلق، مساوات، یکساں حقوق پر زور دیا گیا۔ جنسی اختلاط کو عام کرنے اور انسانوں اور جانوروں کے درمیان فرق و امتیاز کو مٹانے کی تجویز بھی منظور ہوئی۔ اس دستاویز میں یہ اہم باتیں منظور کی گئیں کہ خواتین کو پورے طور پر ضمانت ملنی چاہیے کہ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ صحت کے اعلیٰ معیار اور تمام مادی سہولتوں سے مستفید ہوں۔ لڑکیوں کو بالغ ہوتے ہی یہ حق ملنا چاہیے کہ جنسی اختلاط کے طریقوں اور ناپسندیدہ حمل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیروں سے باخبر ہوں اور نوجوان بچوں اور بچیوں کو عملی طور پر جنسی تعلیم دی جائے۔ اس کے علاوہ ناپسندیدہ حمل یا اسقاط حمل یا ناجائز اولاد کی صورت میں والدین اور سماج کی نگاہ میں ان کو تمام حقوق دیے جائیں اور ان کا ایسا ہی احترام کیا جائے جیسے ایک شادی شدہ عورت کا کیا جاتا ہے۔ غیر قانونی اولاد کا تصور ختم ہونا چاہیے، اختلاط کے معاملہ میں لڑکیوں کو مکمل آزادی ملنی چاہیے کہ وہ جب جس کے ساتھ چاہیں تعلقات قائم کریں، انہیں والدین، سماج اور حکومت کے بندھن سے مکمل آزادی ملنی چاہیے۔

یہ ہے وہ منشور جس کو اقوام متحدہ کی نگرانی میں منظور کیا گیا اور یورپ و امریکہ کی خواتین کی بھلائی اور بہتری کے لیے فیصلہ لیا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ منشور کے نفاذ کے بعد امریکہ و مغربی ممالک پر کیا اثر پڑا۔ وہاں کے معاشرہ کو کیا ملا، گھریلو زندگی میں کس طرح کا انتشار پیدا ہوا اور وہاں کی پوری سوسائٹی پریشانی کی کس دلدل میں پھنس گئی۔

تباہ کن حالات و نتائج: امریکہ کے روزمرہ کے حالات بتاتے ہیں کہ وہاں ہر دس منٹ میں عورت کے ساتھ آبروریزی ہوتی ہے۔ امریکی سوسائٹی میں خاندانی شیرازہ بکھر چکا ہے۔ صرف پندرہ فیصد لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنے والدین کی سرپرستی حاصل ہے۔

برطانیہ، ڈنمارک، فرانس اور امریکہ میں ناجائز بچوں کا تناسب پندرہ فیصد ہے۔

جرمنی میں ایک کروڑ بیس لاکھ افراد تنہا زندگی گزارتے ہیں، ان میں سے ۲۳ فیصد نے شادی ہی نہیں کی۔ اس کے علاوہ شادی کے بغیر مرد و عورت کا ساتھ رہ کر زندگی گزارنے والوں کا تناسب ۲۷ فیصد ہے۔

ایک سال میں ہونے والی چار لاکھ چار ہزار شادیوں میں سے ۶۴ فیصد خواتین کا انجام طلاق

کی صورت میں ظاہر ہوا۔

امریکہ کی مرکزی حکومت کے دفاتر میں کام کرنے والی عورتوں کی ۸۳ فیصد عورتوں کو جنسی طور پر پریشان کیا جاتا ہے۔ امریکہ کے ریاستی دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کی ۸۵ فیصدی نے بتایا کہ ان کے ساتھ جنسی بدسلوکی کی جاتی ہے۔

امریکہ میں نکاح وطلاق کا تناسب برابر ہو گیا ہے۔

امریکہ کے سماجی کارکن بتاتے ہیں کہ سیاسی وسماجی زندگی میں ۹۹ فیصد عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنے میں جنسی استحصال کا سامنا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ ترقی نہیں کرسکتیں۔

رہ گئی بات مغربی ممالک کی تو وہاں کی جو عورتیں سیاسی میدانوں میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں، ان کے بارے میں وہاں کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ آئرلینڈ میں ۳۹ فیصد، ناروے میں ۳۵ فیصد، سوئیڈن میں ۳۳ فیصد، جرمنی میں ۲۲ فیصد، اسپین میں ۱۴ فیصد، امریکہ میں ۶ فیصد، فرانس میں ۵ فیصد اور انگلینڈ میں ۵ فیصد عورتیں سیاسی میدان میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں، جن کا جنسی استحصال خوب ہوتا ہے۔ (محسن انسانیت اور انسانی حقوق، ص ۳۵۴۔ ۳۶۴)

جدید مغربی تہذیب: قدیم وجدید مذاہب اور تہذیب کے نظریات کا جائزہ لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے، کیونکہ مذاہب عالم کی فکر منفی سوچ پر تھی، جس میں عورتوں کو سماج میں کوئی مقام نہیں دیا گیا بلکہ اس کو ہر اعتبار سے برا سمجھا گیا، جبکہ مغربی تہذیب کی فکر ردعمل پر مبنی تھی۔

اس تحریک کے دو مقاصد تھے ایک عورتوں کی آزادی، دوسرے مردوں کے مساوی حقوق کا حصول۔

ایک بنیادی بات یہ بھی تھی کہ اس تحریک کی جو ذمہ دار خواتین تھیں، وہ بنیادی طور پر خودنمائی کا جذبہ رکھنے والی، آوارہ مزاج اور آوارہ فکر تھیں۔ شمع خانہ کے بجائے شمع انجمن بن کر زندگی گزارنے کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ اس لیے جب انہیں آزادی نصیب ہوئی تو وہ اپنے پورے جذبۂ خودنمائی اور آزادئ فکر کے ساتھ میدان عمل میں آئیں اور اپنے فکر وخیال کی خوب خوب اشاعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تحریک تقریباً ڈھائی تین سو سال کے عرصے میں یورپ وامریکہ کے علاوہ پوری دنیا میں پھیل

گئی اور ہر جگہ کی عورتیں متاثر ہوئیں۔

دور حاضر کے نتائج ونقصانات: سوال یہ ہے کہ یہ تحریک آج پوری دنیا میں کامیاب ہوئی یا ناکامی سے ہم کنار ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ پورے طور پر ناکام ہوئی۔ کیونکہ آج بلاشبہہ کچھ عورتوں کو دنیا میں کچھ سیاسی، سرکاری وغیر سرکاری محکموں اور اسکول وکالج میں جگہیں مل گئیں اور ملازمتیں بھی حاصل ہوگئیں لیکن موجودہ اعداد وشمار کے مطابق انہیں آج تک مطلوبہ جگہیں نہیں مل سکیں۔ ہر محکمے میں ملازمت کے حصول کے لیے ان کی کوششیں اب تک مسلسل جاری ہیں تاہم ان کے حصہ میں ناکامی ہی ناکامی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورتوں کے مردوں کے دوش بہ دوش چلنے سے سینکڑوں قسم کے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں، جو انتہائی بھیانک، خطرناک اور ہلاکت خیز ہیں۔ بے حیائی، بے حجابی، عریانیت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے، جس کی وجہ سے عورتوں کے قتل وغارت گری کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ طلاق کی کثرت ہوگئی ہے۔ سب سے بری بات یہ ہوئی ہے کہ نسل و خاندان کی شرافت ونجابت ختم ہوگئی ہے۔ عورتوں کی آوارہ پسندی کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑ گئے ہیں اور ان کی خوش گوار ازدواجی زندگی ختم ہوگئی ہے۔ تعلیم، ترقی اور مساوات کے نام پر عورتوں کا خوب استحصال ہوا۔

قرآن کریم کی انقلابی تعلیمات و پیغامات: مذاہب عالم، قدیم وجدید تہذیب کے بعد تقابلی مطالعہ کے طور پر قرآن کریم کی چند تعلیمات اور احکام وہدایات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

آدمؑ وحواؑ دونوں کو شیطان نے بہکایا: پچھلے صفحات میں تورات وانجیل کے حوالہ سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ حضرت آدمؑ کو حواؑ نے بہکایا اور ان کو شیطان نے بہکایا۔ اس کے برخلاف قرآن کریم نے یہ انقلابی بات کہی کہ شیطان نے صرف حواؑ کو نہیں بلکہ آدمؑ وحواؑ دونوں کو بہکایا۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں "فازلهما الشيطان"۔ قرآن کے اس پیغام سے عورت کے ساتھ نفرت کے بجائے پیار ومحبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے علاوہ احادیث کثرت سے ہیں، جن کی روشنی میں رسول اللہؐ نے عورتوں کے حقوق متعین کرکے امت کے سامنے جو نمونے چھوڑے وہ قیامت تک انسانیت کے لیے قابل تقلید ہیں۔

عورت ذریعۂ سکون وراحت: قرآن مجید کا یہ انقلابی پیغام ہے کہ عورت سکون وراحت کا

ذریعہ ہے۔وہ مرد ہی کی طرح قابل احترام وعزت ہے۔وہ نفرت وعداوت کی چیز نہیں ہے۔قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے مرد وعورت کا جوڑا پیدا کیا تا کہ تم اس سے سکون حاصل کرو۔تم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہولیکن نکاح کے بعد اللہ تعالیٰ تم دونوں میں ایسا پیار ومحبت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ دونوں کے لیے سرمایہ تسکین بنتا ہے۔سمجھ دار لوگوں کے لیے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی نشانی ہے۔قرآن کے الفاظ یہ ہیں ''وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ''۔(سورہ روم، آیت ۲۱)

قرآن نے کہا کہ مغفرت، نجات اور قرب الٰہی کا دارومدار انسان کے اکتسابی عمل پر ہے۔اس معاملہ میں مرد وعورت سب برابر ہیں جو مرد یا عورت جتنا اچھا عمل کرے اسی اعتبار سے اس کا مقام و مرتبہ اللہ کے یہاں بلند ہوگا اور اسی لحاظ سے اس کی مغفرت ہوگی۔اگر کوئی عورت اپنے گھر والوں میں سب سے زیادہ نیک ہے اور اچھا کام کرتی ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ ثواب دے گا۔محض عورت ہونے کی وجہ سے وہ اللہ کے فضل وکرم سے محروم نہیں ہوگی۔اسی بات کو قرآن کریم نے یوں بیان کیا۔ **من عمل صالحا منكم من ذكر و انثى وهو مومن فلنحيينه حياة طيبة و لنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون۔**

دینی امور یعنی قرب الٰہی اور عبادات میں مرد وعورت بلاشبہہ برابر ہیں اور دونوں کو اپنی عبادت کی کمی بیشی کے حساب سے ان کے اعمال کا بدلہ ملے گا لیکن دنیاوی وانتظامی امور میں گھریلو ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔کیونکہ جنسی وفطری کمزوری کے لحاظ سے سماجی زندگی میں عورت کو کہیں نہ کہیں مرد کی ضرورت پڑتی ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کا محافظ ومنتظم قرار دیا اور کہا کہ عورت کی دیکھ بھال، اس کی عزت وآبرو کی محافظت، گھریلو ضروریات زندگی کی ذمہ داری مرد پر ڈالی جاتی ہے۔اس لیے اس کو عورت پر ایک گونہ فضیلت وبرتری حاصل رہے گی تا کہ گھر کا نظم ونسق خوش گوار طریقے سے چل سکے۔عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مرد کی عدم موجودگی میں اپنی عصمت کی حفاظت کرے، شوہر کے حکم کی تابع داری کرے اور گھر کے اندرونی کام کاج، بچوں کی تعلیم وتربیت اور شوہر کی خدمت پورے ذوق وشوق کے ساتھ کرتی رہے۔اس طرح دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

کرنے اور پیار و محبت کے ساتھ زندگی گزارنے سے گھر کا ماحول خوش گوار بنے گا، جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ازدواجی زندگی کا اصل مقصود ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا خالق و مالک ہے جو مرد و عورت کی نفسیات، خواہشات، رجحانات سے بخوبی واقف ہے۔اس کے علاوہ ان کے مزاج و حالات میں جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور ان کے ازدواجی اور معاشرتی زندگی میں قرب و بعد کے لحاظ سے جو مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ان کا علم صرف اللہ کو ہے۔اسی لیے جو حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس میں مرد و عورت اور پورے معاشرہ کے لیے خیر ہی خیر ہے۔

حجاب: قرآن کریم نے عورتوں کو حجاب کا حکم دیا ہے تا کہ ان کی عفت و عصمت محفوظ رہے اور وہ مردوں کی نظر بد سے بچ سکیں۔ یہ حجاب عورتوں کا وقار و احترام بڑھاتا ہے اور انہیں اپنی محافظت کا احساس پیدا کرتا ہے، جو عورتیں بے حجاب گھومتی پھرتی ہیں، ان کو مردوں کی دست درازی کا خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔اس کے برخلاف حجاب والی عورتیں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی عیسوی میں یورپ و امریکہ کی جن تعلیم یافتہ خواتین نے اسلام قبول کیا ہے اور حجاب کا استعمال کیا ہے، انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حجاب کی وجہ سے انہیں محافظت حاصل ہوئی اور معاشرہ میں انہیں احترام و وقار کی نگاہ سے دیکھا گیا۔قرآن کریم نے جس عظمت و احترام سے حجاب کا حکم دیا ہے وہ دنیا کے کسی مذہب یا تہذیب میں نہیں ملتا۔

قرآن کریم نے بے حجابی و عریانیت پر پابندی لگائی اور اس کے لیے اعتدال کا راستہ پیش کیا۔قرآن نے کہا کہ جب عورتیں گھر سے باہر جائیں تو اپنے جسم پر کپڑا ڈال لیا کریں اور بے حجابی اور بے پردگی کے ساتھ نہ نکلیں تا کہ مردوں کے ذہن و دماغ میں شیطانی وسوسہ پیدا نہ ہو۔اعضا و جوارح کو غیروں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔

طلاق: طلاق کے لغوی معنی چھوڑنے اور علاحدہ کرنے کے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں جب کوئی مرد اپنی بیوی کو اس کی بداخلاقی و بدچلنی کی وجہ سے چھوڑ دے اور اپنے گھر سے علاحدہ کر دے تو اس کو طلاق دینا کہتے ہیں۔

میاں بیوی کی زندگی ازدواجی، معاشرتی، اجتماعی لحاظ سے نہایت اہم ہے بلکہ پورے

معاشرے کے لیے سنگ بنیاد ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس بات کو قطعاً پسند نہیں کرتا کہ کوئی مرد اپنی عورت کو طلاق دے۔ کیونکہ میاں بیوی کے علاحدہ ہونے سے نہ صرف میاں بیوی الگ ہوتے ہیں بلکہ دونوں کا پورا خاندان ایک دوسرے سے الگ ہوجاتا ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے طلاق کو پسند نہیں اور اس عمل کو ابغض المباحات کہا گیا لیکن جب حالات ایسے آجائیں کہ بیوی کی بدچلنی و بداخلاقی کی وجہ سے مرد کی زندگی اجیرن ہوجائے اور ہر طرح کی صلح مندانہ کوششوں کے باوجود مرد کا اس کے ساتھ رہنا ناممکن ہوجائے تو ایسی صورت میں میاں اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے تاکہ ہمیشہ کے لیے تکرار کی صورت باقی نہ رہے اور ان کی تلخ زندگی ختم ہو۔ بحالت مجبوری طلاق دینے کا نظریہ سب سے پہلے قرآن کریم نے پیش کیا ورنہ اس سے قبل عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ زمانہ جاہلیت میں مرد جب چاہتا اپنی عورت کو چھوڑ دیتا اور جس سے چاہتا شادی کرلیتا۔ اس کے لیے کوئی اصول نہیں تھا، تعدد ازدواج کی بھی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ ایک آدمی دس بیس شادی کرلیتا۔ محرمات اور غیر محرمات کی پابندی بھی نہیں تھی۔ یہی حال ہندو مذہب اور دیگر مذاہب کا تھا۔ آج مغربی تہذیب کا بھی یہی حال ہے۔

قرآن کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے، جو محرمات وغیر محرمات کی تقسیم کرتا ہے اور کچھ پابندیوں کے ساتھ بحالت مجبوری طلاق کی اجازت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شادی کی بھی حد بندی کرتا ہے کہ کوئی مسلمان مرد چار عورت سے زیادہ شادی نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم کے مطابق طلاق دو مرتبہ ہے، پھر خواہ قاعدے کے مطابق اپنے ساتھ رکھ لو یا خوش اخلاقی کے طریقے سے اس کو چھوڑ دو یعنی بحالت مجبوری طلاق دینی ہو تو طہر کی حالت میں ایک طلاق دے کر ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لو۔ اگر بیوی میں تبدیلی آجائے اور صحیح راستہ پر آجائے تو دستور کے مطابق اپنے ساتھ اس کو رکھ لو لیکن اگر حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہو اور وہ اپنی بدچلنی میں بدستور مبتلا رہے تو خوش اخلاقی کے ساتھ رشتہ کو منقطع کردو۔

وراثت: اسلام سے قبل دنیا کے کسی مذہب و تہذیب میں عورت کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کو اس لائق ہی نہیں سمجھا گیا۔ قرآن کریم پہلی کتاب ہے جس میں پہلی بار عورت کو والدین کی وراثت میں اس کا حق مقرر کیا گیا اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ والدین کے انتقال کے بعد وراثت میں عورت کا حصہ دیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ

وَ الْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا''(سورہ نساء، آیت ۷) یعنی مردوں کے لیے حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں۔ اسی طرح عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ جائیں خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر ہو۔''بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ حصہ ہے''۔

اس آیت سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی وراثت میں حصہ ہے۔ اس حق کو وراثت کی مرضی پر نہیں چھوڑا گیا کہ وہ جس کو چاہے حصہ دے اور جس کو نہ چاہے نہ دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ قانون ہے جس کو ہر حال میں تسلیم کرنا ہے اور عورت کو اس کا حق دینا ہے۔ اس آیت کے علاوہ دوسری آیات میں وراثت کے دیگر اصول وضوابط بیان کیے گئے ہیں۔

زنا کاری: انسانی معاشرے کی ایک بڑی گندی اور بداخلاقی کی ایک بڑی گھناؤنی چیز زنا کاری ہے، جس کی واضح اور متعین سزا دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی بلکہ اسکے برعکس عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ اگر مرد وعورت کی اپنی مرضی سے یہ بدفعلی سرزد ہوئی ہو تو اس کے مطابق یہ زنا کاری نہیں ہے لیکن قرآن کریم صاف صاف کہتا ہے کہ یہ بدفعلی دونوں کی رضامندی سے ہوئی ہو یا کسی ایک کے جبر وزیادتی سے۔ وہ ہر حال میں زنا کاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ اس کو انسانی معاشرے کے لیے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی سخت سزا دینے کو کہا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر یہ عمل بدغیر شادی شدہ لڑکی اور غیر شادہ شدہ لڑکے سے ہوا ہو تو دونوں کو سوسو کوڑے مارے جائیں لیکن مرد وعورت اگر شادہ شدہ ہوں تو انہیں رجم یا سنگسار کیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ مرجائیں اور یہ سزا چھپا کر نہیں بلکہ عام لوگوں کے سامنے دی جائے تاکہ دیکھنے والوں میں اس سے خوف ودہشت پیدا ہو۔ انہیں عبرت حاصل ہو اور وہ اس گندی چیز سے دور رہیں۔ قرآن نے یہ بھی کہا کہ سزا دینے میں ذرہ برابر نرمی نہیں کی جائے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے جو ہر طرح کی اچھی بری باتوں سے باخبر ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ''اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ''۔ (سورہ نور، آیت ۲)

چوری: انسانی سوسائٹی میں چوری ایک بڑا جرم ہے، کیونکہ اس سے سماجی زندگی کے امن وامان میں خلل پڑتا ہے اور لوگوں کی پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں۔اس لیے قرآن کریم نے اس کو ناجائز قرار دیا اور اس کے لیے سخت سزا تجویز کی۔قرآن کریم نے کہا ''السَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءً ۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ'' (سورہ مائدہ، آیت ۳۸) یعنی چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ (داہنے گٹے سے اوپر) تک کاٹ دو۔ان کے اس کام کے عوض میں جو بطور سزا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والے ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔

چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت دونوں کی سزا ایک ہے۔چوری کی سزا دیتے وقت لوگوں کی ایک جماعت وہاں موجود رہنی چاہیے، جو دیکھے اور عبرت حاصل کرے۔چور کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے۔یہ چند احکام کے خلاصے ہیں جو یہاں بطور نمونہ بیان کیے گئے ورنہ اس کے علاوہ بہت سارے احکام وہدایات ہیں، جو عورتوں کی انفرادی واجتماعی اور معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں۔وہ سب قرآن کریم میں مختلف موضوعات کے تحت بیان کیے گئے ہیں، جو وہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اخبارِ علمیہ

''آن لائن حجاز مسلم کالج''

ایک خبر کے مطابق درس نظامی کے ماہرین کے مشورہ سے ایک کالج کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ جس میں درس نظامی پر مشتمل عالمیت کے تین سالہ نصاب کی تعلیم کا آن لائن انتظام کیا گیا ہے۔ اس سے ہائی اسکول سے یونیورسٹی سطح تک کے طلبہ اور دوسرے شغل میں مصروف صاحبِ ذوق افراد فائدہ اٹھاسکیں گے۔ برصغیر پاک وہند کے طلبہ وطالبات کے لیے اردو اور مقامی زبانوں اور یورپ اور امریکہ کے خواہش مندوں کے لیے انگریزی زبان میں تدریس کا نظم کیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق جنوری کے پہلے ہفتہ میں اس کا باقاعدہ آغاز ہوگا۔ مزید تفصیلات کے لیے ''حجاز مسلم کالج ڈاٹ کام'' نامی ویب سائٹ دیکھی جاسکتی ہے۔

''چین میں عظیم الشان کتب خانہ کا افتتاح''

چین کے شہر تیانجن کے ضلع بنہائی میں ۳۴ر ہزار مربع میٹر پر پھیلی ہوئی وسیع وعریض ۵ منزلہ لائبریری کا افتتاح عمل میں لایا گیا ہے، جس کو ڈنمارک کی ایک فرم ''ایم آر ڈی وی'' نے تیانجن کے شہری منصوبہ کے ادارے کے ساتھ مل کر تیار کیا ہے۔ پورا ہال بیضوی انداز میں بنایا گیا ہے۔ جس کو درمیان سے دیکھنے پر آنکھ کا گمان ہوتا ہے، اس میں ۱۲ر لاکھ کتابیں ہیں۔ مطالعہ کے کمرے نیچے، درمیان میں دفاتر اور میٹنگ روم کے علاوہ کمپیوٹر، آڈیو، ویڈیو اور دیگر کمرے ہیں۔ لائبریری اپنی خوبصورتی، تزئین وآرائش میں جدید ترین سہولت کا شاہکار ہے، جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ اس کی تکمیل میں تین سال کا عرصہ صرف ہوا ہے۔ آج کل کے ڈیجیٹل اور کمپیوٹر کے عہد میں ایسی شاندار لائبریری کے قیام سے چینیوں کے ذوق مطالعہ اور کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ (انقلاب ۱۹ر نومبر ۲۰۱۷ء)

''آئن اسٹائن کے خط کی قیمت''

البرٹ آئن اسٹائن جرمنی سے تعلق رکھنے والا عالمی شہرت کا حامل سائنس داں ہوا۔ اس کو نظریہ اضافیت کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں اس کا تحریر کردہ ایک سو دو سالہ قدیم تاریخی خط

ایک کرور بارہ لاکھ میں نیلام کیا گیا ہے۔ یہ خط اس نے اپنے قریبی دوست مائیکل بیسو کو اپنے نظریۂ اضافیت کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ برطانوی نیلام گھر کرسٹی کے مطابق آئن اسٹائن نے ۴؍ سے ۲۵؍ نومبر کے درمیان پروسین اکیڈمی آف سائنسز میں نظریہ اضافیت پر مشتمل چار صفحات جمع کرائے تھے۔ برلن پوسٹ آفس کی ۱۰؍ دسمبر ۱۹۱۵ء کی اس خط پر مہر لگی ہے۔ اس خط کی حقیقی قیمت ۳۰؍ ہزار ڈالر بتائی گئی ہے لیکن اس پر آئن اسٹائن کے دستخط کے سبب عقیدت مندوں کے نزدیک اس کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ (اخبار مشرق، کلکتہ ۹؍ دسمبر ۲۰۱۷ء)

''اعتراف سرقہ''

مصر، اردن، لبنان اور شام و فلسطین کے عرب ممالک ہزاروں برس قدیم تہذیب اور نوادرات کا مخزن ہیں۔ خبر ہے کہ آسٹریلیا کی ۹۵ سالہ خاتون جون باورڈ جو اقوام متحدہ کے ایک سابق سفیر کی اہلیہ ہیں نے ان ممالک میں اپنے قیام کے دوران وہاں کے بعض اہم قدیم مخطوطات، ظروف اور دیگر نوادرات چوری کر لیے تھے۔ انہوں نے یہ چوریاں ۱۹۶۰۔۱۹۸۰ء کے دوران کی تھیں۔ آسٹریلوی ماہر آثار قدیمہ مونیکا حنا نے ان کے پاس موجود نوادر کے اصلی اور ان کی قیمت لاکھوں ڈالر ہونے کی تصدیق کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق انہوں نے اپنے شوہر کی سفارتی حیثیت کا فائدہ اٹھایا اور ان پر اس وقت ہاتھ صاف کیا جب مصری حکام، عالمی ماہرین کے ساتھ اہرام کے اطراف میں کھدائی میں مصروف رہتے تھے، چوری سے قبل وہ اس کی تاریخی اہمیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتی تھیں کہ یہ نوادر کس بادشاہ کے عہد سے متعلق ہیں۔ جون کے پاس فرعون کے ماسک، ہتھیار، مخطوطات اور ظروف بھی موجود ہیں لیکن ان کی صحیح تعداد کا اب تک علم نہیں ہوسکا ہے۔ دوسری جانب قاہرہ میں متعین آسٹریلوی سفیر نیل پاکنز نے تصدیق کی ہے کہ مصری حکومت کے مطالبہ پر آسٹریلوی حکومت تحقیق کر رہی ہے۔ شامی، فلسطینی اور لبنانی حکام بھی اس سلسلہ میں ابتدائی تحقیقات میں مصروف ہیں اور انہوں نے بھی آسٹریلوی حکام سے ان نوادر تک رسائی کا مطالبہ کیا ہے۔
(تفصیل منصف حیدرآباد، ۲۸؍ نومبر ۲۰۱۷ء میں دیکھی جاسکتی ہے)

''ٹوپولوجیکل انسولیٹر کے متعلق ایک تحقیق''

ٹوپولوجیکل انسولیٹر دراصل ایک ایسا مادہ یا دھات ہے جو اپنی اوپری سطح پر بجلی کی سربراہی

کرتا ہے لیکن اندرونی سطح پر بجلی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اندر سے وہ بجلی سے محفوظ رہتی ہے۔اس قسم کی دھاتوں کے اب تک بہت ہی کم نمونے دستیاب ہوسکے ہیں۔اپنی مخصوص صفات کے سبب اس کا استعمال بہت سی چیزوں میں کیا جاسکتا ہے۔انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے شعبہ برائے طبعیات کے ایک طالب علم نے ''فزیکل ریویولیٹر'' میں شائع اپنی نئی تحقیق میں اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ٹوپولوجیکل انسولیٹر کسی بھی واضح نقشہ سے محروم اشیا میں پائے جاسکتے ہیں جیسے شیشہ کی کچھ قسمیں ہیں۔جن میں ذرات بے ترتیبی کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔اسی شعبہ سے وابستہ سینئر پروفیسر کا کہنا ہے کہ اب اس قسم کے مادوں کے حصول کے مواقع بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔اس مطالعہ میں دورخی اور سہ رخی اشیا کی تعمیر کے لیے کمپیوٹر ماڈلس کا استعمال کیا گیا تھا۔ بہرحال اس مطالعہ کے بعد اب محققین اس مادہ کو صرف بلوری قلمی اشیا ہی میں تلاش نہیں کریں گے بلکہ امید ہے کہ خالص علمی اور نظریاتی طور پر بھی اب وہ بہت سی اشیا کی طرف دیکھ سکتے ہیں۔(تفصیل اخبار مشرق، دہلی، ۶/دسمبر ۲۰۱۷ء میں ملاحظہ فرمائیں)

''میڈیٹیشن یا مراقبہ کی افادیت پر امریکی تحقیق''

امریکی ریاست شمالی کیرولینا میں واقع ویک فارسیٹ یونیورسٹی کے ماہرین نے اپنی حالیہ تحقیق میں کہا ہے کہ درد کو دور کرنے میں مراقبہ انتہائی موثر و مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔طبی ماہرین نے جرنل فار نیوروسائنس میں شائع اپنی تحقیق میں درد میں مبتلا ۷۵/افراد کو بیس منٹ تک مراقبہ میں مصروف رکھا جس کے بعد ان کے درد میں حیرت انگیز طور پر کمی واقع ہوئی۔معلوم ہوا اس سے انسانی دماغ پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور مریض کے اندر قنوطیت اور پژمردگی کی جگہ مسرت وخوشی کے جذبات واحساسات کی افزائش ہوتی ہے۔مراقبہ دراصل اکائی یا وحدت دماغ کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کا نام ہے۔اس کے اصولوں میں انکسار، عاجزی، برداشت، صبر وتحمل اور اطمینان اور دھیان جیسی ہدایات شامل ہیں۔اس سے جسم پر مثبت اثر پڑتا ہے۔(تفصیلات ماہنامہ احمد ٹائمز، دہلی، نومبر ۲۰۱۷ء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

نسخۂ حمیدیہ

علی گڑھ
۱۵؍دسمبر ۲۰۱۷ء

مدیر محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! باعث تحریر یہ ہے کہ معارف اکتوبر ۲۰۱۷ء میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے مقالے بہ سلسلہ نسخۂ حمیدیہ پر پروفیسر احتشام احمد ندوی کا مراسلہ نظر سے گزرا تھا، میں نے خیال کیا تھا کہ ایک لایعنی مراسلہ کا ظفر صاحب جواب نہیں دیں گے لیکن انہوں نے تازہ شمارے میں اس کا جواب دیا ہے۔ ظفر صاحب کے انکسار نے ان کے علم وفضل پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ فاضل مراسلہ نگار نے غالباً ایک عام ندوی کی استعداد کے بقدر ان کو آنکا ہوگا اور اپنی دانست میں یہ سمجھا ہوگا کہ ان کے اعتراضات کا شاید ظفر صاحب جواب نہ دے سکیں گے۔

غالب اور غالبیات کے طویل المدتی مطالعہ کی بنیاد پر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھ رہا ہوں، کہ ظفر صاحب کا غالبیات کا بھی قابل لحاظ مطالعہ ہے اور وہ غالبیات سے متعلق قدیم وجدید تحقیقات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس مراسلہ میں انہوں نے جواب کے ضمن میں جو اصولی باتیں کی ہیں اس سے میں اتفاق رکھتا ہوں۔ ایک گزارش ہے بڑے ادب کے ساتھ۔ اعتراض برائے اعتراض قسم کے مراسلے شائع نہ کیا کیجیے، علمی مضامین پر مراسلات کے ذریعہ اگر کسی تسامح، کسی اضافہ، یا کسی ایسے علمی نکتہ کی نشاندہی کی گئی ہو جس تک مقالہ نگار کی نظر نہ پہنچ سکی ہو، تو ایسے مراسلہ سے علم و ادب میں اضافہ ہوتا ہے لیکن کسی کی تخفیف یا اپنی علمی برتری کے لیے مراسلہ لکھنا ایک ایسا عمل ہے جس سے پرہیز کیا جانا چاہیے۔ امید ہے کہ اس قسم کے مراسلوں پر آیندہ آپ کی نظر رہے گی۔

مولانا شبلی نعمانی کے دو نئے خطوط دریافت ہوئے ہیں، عنقریب آپ کو بھیجوں گا۔

مخلص

ڈاکٹر شمس بدایونی

وفیات

پروفیسر ستیش چندرا

پروفیسر محمد سجاد

پروفیسر ستیش چندرا (۲۰۱۷-۱۹۲۲ء) ۱۳/اکتوبر ۲۰۱۷ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ ہندوستان کے مقبول ترین تاریخ نویسوں میں شامل تھے۔ گیارہویں جماعت کے لیے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ پر جو نصابی کتاب انھوں نے لکھی تھی اس نے ان کی شہرت کو تاریخ کے طلبہ و طالبات، اساتذہ اور تاریخ نویسوں کے حلقے سے آگے عام قارئین تک پہنچا دیا تھا۔ اس مقبولیت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سلیس اور آسان نثر کے وسیلہ سے انھوں نے گہری اور پیچیدہ تحقیقات کو قلم بند کرنے میں کامیابی حاصل کی جو نہایت مشکل کام تھا۔ اس طرح انھوں نے تاریخ سے متعلق دانشورانہ تحقیقات کو مین اسٹریم میں متعارف کرایا اور اسے اسکول کی نصابی کتابوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ اسی لیے ان کی یہ کتاب سول سروس کی تیاری کرنے والے امیدواروں کے لیے بھی بہت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ گرچہ اس کتاب میں بعض کمیاں بھی تھیں، مثلاً عہد وسطیٰ کے بہار کی تاریخ ان کی توجہ سے محروم رہی، حالانکہ اس وقت تک سید حسن عسکری (۱۹۰۱-۱۹۹۰) کی صوبہ بہار سے متعلق تحقیقات منظر عام پر آ چکی تھیں۔

بعد میں جب حکومت نے اس نصابی کتاب کی جگہ دوسری کتاب تیار کرائی تو پروفیسر چندرا نے اس کتاب میں بہت کچھ اضافہ کے بعد اسے پھر سے شائع کیا۔ ان کی علالت کے باعث اس میں کچھ کمیاں پھر بھی باقی رہ گئیں۔ قارئین کو بجا طور پر توقع تھی کہ اس ترمیم و اضافہ میں جدید ترین تحقیقات اور ان سے متعلق محققین کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے تعرض کیا جائے گا اور ان پر ضروری حد تک بحث و تمحیص کی جائے گی، بالکل اسی طرح جس طرح جدید عہد کی تاریخ ہند کے لیے سومیت سرکار

شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

(۱۹۸۳ء)، شیکھر بندوپادھیائے (۲۰۰۴ء)، اور اشیتا بنرجی دوبے (۲۰۱۴ء) کی نصابی کتابیں دستیاب ہیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تاریخ دانوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے لیے اس قسم کی نصابی کتاب لکھنے کی ضرورت اب تک محسوس نہیں کی۔

پروفیسر ستیش چندرا کے والد سر سیتا رام میرٹھ کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ یہیں ان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اس وقت وہاں شعبۂ تاریخ کے صدر مشہور مورخ سر شفاعت احمد خاں (۱۹۴۸-۱۸۹۳) تھے۔ اس وقت الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ نے بنیادی مآخذ پر مبنی عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کے میدان میں بڑا امتیازی مقام حاصل کرلیا تھا۔ رشبروک ولیم، آر۔ پی۔ ترپاٹھی، بینی پرساد وغیرہ نے مختلف مغل بادشاہوں پر کتابیں شائع کیں۔

ان تاریخ نویسوں نے اپنی تحقیق و تصنیف سے لبرل، سائنٹفک قوم پرستانہ تاریخ نویسی کی بنیاد مضبوط کی۔ ان تحقیقات کے مطابق ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہاں ہزاروں برسوں سے مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ مصالحت اور آشتی کے ساتھ مل جل کر رہتے آئے ہیں اور ترکوں اور مغلوں کی آمد سے یہ تہذیبی روایت مزید ثروت مند، مضبوط اور مستحکم ہوئی ہے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں یہ بات بھی ابھر کر سامنے آئی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کو جغرافیائی اعتبار سے متحد کرنے میں برٹش سے پہلے موریوں، ترکوں اور مغلوں کا اہم رول رہا ہے۔

ستیش چندرا نے ۱۹۴۴ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں شرکت کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن اپنے استاد اور معروف مورخ پروفیسر آر۔ پی۔ ترپاٹھی کے حکم کی تعمیل میں عہد وسطی کی تاریخ میں تحقیق کرنے پر آمادہ ہوئے۔ سر جدوناتھ سرکار (۱۹۵۸-۱۸۷۰) کی تصنیف، فال آف دی مغل امپائر، کی سبھی چار جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی تھیں (۱۹۳۲ء)۔ اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ مغلوں کے زوال کی بڑی وجوہات میں سے ایک اہم وجہ اورنگ زیب کے خلاف "ہندو ردعمل" تھا۔ ترپاٹھی نے چندرا کو مشورہ دیا کہ انہیں اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ کی تحقیق پر اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور جدوناتھ سرکار کی تصنیف کا تحقیقی سطح پر جائزہ لینا چاہیے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جدوناتھ نے اس کام میں ستیش چندرا کی ہر ممکن مدد کی۔ کلکتہ میں اپنی ذاتی

لائبریری کے دروازے ان کے لیے کھول دیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے دوسرے اہم کتب خانوں کے سلسلہ میں ان کی راہنمائی بھی کی اور سفارش بھی۔ مثلاً سیتا مئو، مدھیہ پردیش کی لائبریری، جہاں جانے پر انہیں معلوم ہوا کہ ان کی مدد کے لیے جدوناتھ سرکار کا خط پہلے ہی موصول ہو چکا تھا۔ اس واقعہ سے آج کل کے بڑے مورخوں کو سبق لینا چاہیے کہ اپنے موقف سے اختلاف رکھنے والے محققین کی بھی مدد اور حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور اختلاف رکھنے والے نوجوان محققین کے خلاف انتقامی رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ یہی ستیش چندرا اور جدوناتھ سرکار جیسے تاریخ دانوں کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

ستیش چندرا اپنی مادر درس گاہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں کچھ دنوں بحیثیت لکچرر خدمات انجام دینے کے بعد ریڈر کی حیثیت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۲ء تک وابستہ رہے۔ قیام علی گڑھ کے دوران ہی انہوں نے اپنے پی ایچ ڈی مقالہ کو ۱۹۵۹ میں شائع کرایا۔ اس مشہور زمانہ تصنیف کا عنوان تھا، ''پارٹیز اینڈ پولیٹکس ایٹ دی مغل کورٹ'' (۱۷۰۷-۱۷۴۰)۔ ان کی اس تحقیق سے یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ مغل دربار میں امرا کی گروہ بندی اور اقتدار کے لیے رسہ کشی، اور زرعی اعتبار سے بہتر جاگیریں حاصل کرنے کے لیے جھگڑوں کے نتیجہ میں مغل حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کتاب میں انہوں نے جدوناتھ سرکار سے اختلاف کرتے ہوئے اس دلیل کو مسترد کر دیا کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے مغلوں کا زوال ہوا۔ ستیش چندرا نے اپنی وضاحت میں یہ دلیل بھی دی کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو ان کی وفات کے ۶ برسوں کے بعد ہی ان کے جانشینوں نے ختم کر دیا تھا۔

علی گڑھ میں ستیش چندرا کی دوسری اہم کتاب شائع ہوئی۔ یہ فارسی تصنیف بال مکند نامہ تھی جو اٹھارہویں صدی کے ایک حکمراں کے بارے میں ہے۔ اس کو پہلی بار انہوں نے ہی استعمال کیا تھا۔ ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ بدقسمتی سے اس نوعیت کی متعدد کتابیں ہیں جن کا ابھی تک انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس طرح وہ ابھی تک تاریخ پر کام کرنے والوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس سلسلہ میں خدابخش لائبریری میں محفوظ کرم علی کی کتاب ''مظفر نامہ'' کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ اٹھارہویں صدی کے اس اہم ماخذ کا ابھی تک انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوسکا ہے۔ اس سلسلہ میں بجاطور پر نظریں علی گڑھ کی طرف اٹھتی ہیں۔

ستیش چندرا کی کتاب (۱۹۵۹) سے ایک بڑا مقصد یہ حاصل ہوا کہ مغل مطالعات کو انفرادی

حکمرانوں کی دانستہ یا نادانستہ غلطیوں پر مرکوز کرنے کے بجائے اب زیادہ اہمیت اس بات پر دی جانے لگی کہ وسیع تر پیمانے پر سماجی، اقتصادی، اور انتظامی سطحوں پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ علاوہ ازیں اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت بھی شدت سے محسوس کی گئی کہ کیا ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی طوائف الملوکی اور تہذیبی جمود کی صدی تھی؟ اپنی تصنیف کے چوتھے ایڈیشن (۲۰۰۲) میں انہوں نے اپنے بدلے ہوئے موقف کی مزید وضاحت کی کہ مغل حکومت کا زوال بنیادی طور پر جاگیرداری نظام کے اندرونی انتظامی بحران کا اور جاگیر میں دی جانے والی زمینوں کی کمی کا نتیجہ تھا۔

ان تحقیقات اور تصانیف کے علاوہ ستیش چندرا نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اہم انتظامی ذمہ داریاں بھی بحسن وخوبی انجام دیں۔ وہ طلبہ کے غیر اقامتی ہال (NRSC) کے بانی پرووسٹ تھے (ان سے قبل، پراکٹر ہی اس ہال کے پرووسٹ ہوتے تھے)، NRSC کلب کے بانی تھے، اور ۶۲-۱۹۶۱ء کے دوران یونیورسٹی کے پراکٹر بھی رہے۔ یونیورسٹی کے اولڈ گیسٹ ہاؤس (یعنی گیسٹ ہاؤس نمبر ۲) کو بھی انہوں نے ہی بنوایا تھا۔ اظہار ممنونیت کا تقاضا ہے کہ اس گیسٹ ہاؤس کو ان کے نام سے ہی منسوب کردیا جائے یا NRSC ہال کو ان کے نام سے منسوب کردیا جائے۔

پروفیسر ستیش چندرا کا علی گڑھ سے جذباتی لگاؤ تھا اور اسے ہمیشہ بڑی محبت سے یاد کرتے تھے۔ انہوں نے لکھا بھی ہے کہ ۱۹۴۰ کی دہائی سے علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ میں عہد وسطی کے ہند کی تاریخ نویسی میں مارکسی نظریہ کی طرف جھکاؤ بڑھنے لگا تھا۔ اس کی راہنمائی کر رہے تھے پروفیسر محمد حبیب (۱۸۹۵-۱۹۷۱) اور پروفیسر نور الحسن (۱۹۲۱-۱۹۹۳)، جو ۱۹۴۹ میں اسلامی تاریخ کے ماہر پروفیسر ایچ اے آر گب (۱۸۹۵-۱۹۷۱) کی نگرانی میں آکسفورڈ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر واپس علی گڑھ آگئے تھے۔ آکسفورڈ میں پروفیسر محمد حبیب کے نگراں مشہور مستشرق ڈی اس مارگولیتھ (۱۸۵۸-۱۹۴۰) تھے۔

ستیش چندرا نے لکھا ہے کہ علی گڑھ میں کارل مارکس کے ''ایشیاٹک موڈ آف پروڈکشن'' پر تنقید کی جاتی تھی اور مارکس کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ ایشیائی معاشرہ انگریزوں کے آنے تک جمود کا شکار تھا۔ پروفیسر ستیش چندرا کے مطابق علی گڑھ میں اس زمانے کی دنیا کے تمام بڑے مورخ تشریف لاتے تھے۔ مثلاً کرسٹوفر ہل (۱۹۱۲-۲۰۰۳)، ایریک ہابسبام (۱۹۱۷-۲۰۱۲)، ای۔ پی۔ ٹامسن (۱۹۲۴-۱۹۹۳)، ڈی۔ ڈی۔ کوسامبی (۱۹۰۷-۱۹۶۶)، آر۔ ایس۔ شرما (۱۹۱۹-۲۰۱۱) وغیرہ۔ اور تاریخ اور

تاریخ نویسی پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ پروفیسر نورالحسن نے مارکسی نظریہ، کہ ہندوستان میں زمینوں کی نجی ملکیت معدوم تھی، کی تردید کی۔ ان تمام مورخین نے علی گڑھ میں لبرل سیکولر سائنٹفک تاریخ نویسی کو فروغ دیا۔

ستیش چندرا کا ان تمام تحقیقات، تصنیفات اور انتظامی خدمات کے باوجود پروفیسر کے عہدے پر تقرر نہیں ہوسکا۔ ستیش چندرا کے پروفیسر بننے کے امکانات جب ۱۹۶۲ء میں یکسر معدوم ہوگئے تو وہ علی گڑھ چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ پھر وہاں سے جے پور۔ وہاں انہوں نے راجستھانی مآخذ پر مبنی تحقیقات کے وسیلہ سے عہد وسطی کے ہندوستان کی علاقائی تاریخ کے بالکل نئے میدان میں کام کا آغاز کیا اور اس کے نہایت اہم نتائج سامنے آئے۔ دل باغ سنگھ اور ایس پی گپتا نے انہیں سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنی تحقیقات پیش کیں اور اس طرح اٹھارہویں صدی کی تاریخ کی نئی جہات اور امکانات روشن ہوئے۔

جے پور سے پروفیسر ستیش چندرا جے این یو آگئے جو ابھی نئی نئی بنی تھی اور وہیں سے ریٹائر ہوئے۔ لیکن جے این یو نے بھی انہیں پروفیسر امریطس کے درجے سے نہیں نوازا۔ البتہ وہ یو جی سی کے نائب چیئرمین اور چیئرمین کے عہدے تک ضرور پہونچے۔ اور اس حیثیت سے انہوں نے علی گڑھ کو خوب نوازا۔

اپنے دوست پروفیسر نورالحسن کے ساتھ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ ایک بڑا تدریسی اور تحقیقی ادارہ، دہلی اسکول آف ہسٹری قائم کریں گے۔ یہ خواب تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا کیونکہ پروفیسر نورالحسن کا ۱۹۹۳ء میں انتقال ہوگیا۔ لیکن ان لوگوں نے ۱۹۸۷ء میں ایک دوسرا ادارہ انڈین اوشن اسٹڈیز قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرلی جس کی سربراہی پروفیسر ستیش چندرا تاحیات کرتے رہے۔ اس میں بڑے مورخین اور محققین کے لیے ایک بڑا اسبق ہے۔

علی گڑھ تو اپنے محسن پروفیسر نورالحسن کے لیے بھی اظہار ممنونیت میں شدید بخل کا مرتکب رہا۔ ان کے انتقال پر علی گڑھ کے کسی ہم کار یا شاگرد و استاد نے ان پر تعزیتی مضمون نہیں لکھا۔ یہ نیک کام بھی جے این یو کے نیلادری بھٹاچاریہ نے انجام دیا۔ ٹائمس آف انڈیا میں شائع اپنے مضمون میں نیلادری نے یہ واضح کیا کہ نورالحسن کے کارناموں کو پرکھنے کے لیے یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے کتنی تحقیقات

شائع کیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کے مشوروں، امداد اور حوصلہ افزائی سے ان کے شاگردوں نے کتنی تحقیقات شائع کیں اور کن کن نئے میدانوں میں دادِ تحقیق دی۔

انتظامی تاریخ کے وسیع علم کی وجہ سے انھیں ۱۹۸۹ء میں سول سروسز کے مقابلہ جاتی امتحانات میں ریفارم کے لیے ایک کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس امتحان میں مضمون نویسی کو پھر سے متعارف کرایا اور انٹرویو کے نمبروں میں بھی اضافے کی سفارش کی جسے کمیشن نے قبول کیا۔

پروفیسر چندرا وقفے وقفے سے علی گڑھ آتے رہے اور اپنی شفقتوں اور مشوروں سے نوجوان طلبہ وطالبات کو نوازتے رہے۔ ۱۹۹۲ء میں جب یو. جی سی اور مرکزی حکومت کے تعاون سے بادشاہ اکبر کی ۴۵۰ ویں سالگرہ علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ میں منائی گئی تو انہوں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ نے اکبر کی ۴۰۰ ویں سالگرہ کی مخالفت کی تھی۔ علی گڑھ میں اکبر پر ایک مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا۔ اس مضمون کے ممتحن خود ستیش چندرا تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ اس مقابلہ کا پہلا انعام ہمارے ایک ایسے ہم جماعت کو ملا جو موڈرن انڈین ہسٹری میں ایم۔ اے کر رہا تھا اور وہ فارسی زبان و ادب سے بھی واقف تھا تو انہیں افسوس ہوا کہ ایسا طالب علم تو عہد وسطیٰ کی تاریخ ہند پر تحقیق کے لیے موزوں ہوتا۔ تب انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ بہت جلد وہی طالب علم حالات کے جبر کی وجہ سے تحقیق کے بجائے سول سروسز کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور اس طرح علمی دنیا ایک ذہین اور ابھرتے ہوئے طالب علم سے محروم ہو جائے گی۔

پروفیسر نورالحسن ہی کی طرح پروفیسر ستیش چندرا نے ہندوستان کی تاریخ عہد وسطیٰ کے طالب علموں اور مورخوں کی آنے والی نسلوں کے لیے کچھ مفید مشورے اور نصیحتیں تحریر کر دی ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب پر جو آراء قائم کی گئی ہیں (تنگ نظر، ناعاقبت اندیش اور مثبت تخیل سے محروم حکمراں)، ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ایسے حکمرانوں اور ان کے عہد کا مطالعہ وسیع تر اور جامع سطح پر کیا جانا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی سوال اٹھایا کہ ۱۹۸۴ء میں اورنگ زیب نے دکن پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی لاتے ہوئے فوجی طریقہ کار کیوں اپنایا۔ ان کا خیال تھا کہ اس سوال پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے انہوں نے مطلوبہ بنیادی ماخذ کی نشان دہی بھی کر دی تھی۔

پروفیسر ستیش چندرا کے بعد اورنگ زیب کے عہد اور ان کی پالیسیوں پر مزید تحقیقات پروفیسر

محمد اطہر علی (۱۹۲۵-۱۹۹۸) نے کیں اور یہ وضاحت کی کہ سترہویں صدی کے اخیر میں اقتصادی بحران کے پیش نظر اورنگ زیب نے جزیہ پھر سے نافذ کیا تھا جس میں کسی مذہبی تنگ نظری کا جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ انہوں نے اعداد و شمار کی مدد سے یہ بھی ثابت کیا کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہندو منصب داروں کا تناسب ایک تہائی سے زیادہ تھا اور یہ تناسب مغل دورِ حکومت میں سب سے زیادہ ہے۔ اس طرح جدوناتھ سرکار کی رائے کے برعکس اورنگ زیب کے بارے میں ایسے تمام مثبت لیکن مخفی پہلو اجاگر کر دیے گئے۔ ستیش چندرا اور اطہر علی کی تحقیقات کی بنیاد پر بی۔ این پانڈے کی کتاب اور اوم پرکاش کے کتابچہ "اورنگ زیب: ایک نیا زاویۂ نظر" کے ذریعہ اورنگ زیب کے بارے میں نئی دریافتوں کو قبول عام حاصل ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر اطہر علی نے اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پروفیسر ستیش چندرا کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔

پروفیسر ستیش چندرا نے یہ مشورہ بھی دیا کہ نوجوان مورخین کو علم سماجیات، انتھرو پولوجی اور quantitative analysis سے استفادہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے تاریخ نویسی میں مرکز (core) اور حاشیہ (periphery) کے امتیاز کے خلاف احتجاج کیا اور یوروپ کی مغربی مرکزیت یا فوقیت eurocentrism کو چیلنج کیا۔

وہ ہندوستان میں تاریخ نویسی کے بارے میں بہت فکرمند رہا کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان تمام سیاسی گروہوں اور نظریوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کرنا چاہیے جو ہندوستان میں ایک نسل (آریہ)، ایک تہذیب (ہندو)، ایک زبان (سنسکرت اور سنسکرت زدہ ہندی) کو زبردستی تھوپنا چاہتے ہیں۔ چندرا صاحب اس بات پر زور دیتے رہے کہ تاریخ نویسوں کا مسلسل سروکار سماجی تبدیلیوں کے مطالعے اور مشاہدے سے رہنا چاہیے۔

یوں تو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہی ہے لیکن غم یہ ہے کہ وہ ہم سب سے ایسے وقت میں جدا ہوئے جب ملک میں تاریخ کو مسخ کرنے کی مہم پوری شدت سے جاری ہے اور ایسے روشن خیال مورخ کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

مطبوعات جدیدہ

نعمۃ المنان (مجموعہ فتاوی) جلد اول: از ڈاکٹر فضل الرحمٰن، جمع وترتیب مولانا احمد فضل الرحمٰن مدنی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۸۸، ناشر: مجلس الفقہ الاسلامی ہند، پتہ: جامعہ محمدیہ، منصورہ، مالیگاؤں، مہاراشٹر اور شنکر نگر، بلرام پور، یوپی اور دہلی کے دیگر پتے۔

شریعت مطہرہ قیامت تک کے لیے ہے، اس لیے ہر زمانہ میں اس سے متعلق مسائل اور ضرورتوں کے افہام وتفہیم کے لیے علماء وفقہاء کا وجود اور ان کی حفاظت، اللہ تعالیٰ کی ان خاص نعمتوں میں ہے جو مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کے لیے کارآمد اور نفع بخش ہیں، اگر یہ طبقہ علماء وفقہاء اور ان ہی کے درمیان ادارہ افتاء نہ ہوتو پھر ذاتی خواہش اور محدود علم اور اس سے بھی زیادہ ناقص فہم کی فتنہ سامانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے بے شمار احسانوں میں روزمرہ نئے نئے، کبھی پیچیدہ، کبھی لاینحل دکھائی دینے والے معاملات میں حق وانصاف، اعتدال وتوازن کے ذریعہ آسانی پیدا کرنا ہے۔ اسی لیے استفتاء وفتاوی کا بے نظیر عمل اسلام کی یہ دولت پہلی بار بحیثیت مستقل شعبہ کی شکل میں انسانوں کو حاصل ہوا، علماء وعوام سے براہ راست تعلق کی یہ مثال اور کہاں؟ یہ سلسلہ الحمدللہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں عقیدہ، سنن وبدعات، علم، طہارت یعنی غسل ووضو، تیمم، مسائل نسواں، نجاست کے عنوانوں کے تحت قریب تین سو سوالات کے جواب آگئے ہیں، جو ایک فاضل عالم کے قلم سے ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ معتبر اور ثقہ اور اہل ذکر عالم ہیں، جامعہ محمدیہ منصورہ میں ایک زمانہ سے افتاء کی ذمہ داریاں نبھاتے آئے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کی مجمع الفقہ الاسلامی کے رکن ہیں۔ اس لیے ان کے فتوؤں میں فقہی مہارت اور اسلاف کرام کی طرح احتیاط کے ساتھ مستفتی کے ماحول پر نظر اور اس کی اصلاح کی حکیمانہ شان نظر آتی ہے۔ شیخ انصار زبیر محمدی کی تقریظ مفصل اور جامع ہے، جنہوں نے ایک روایت بطور استشہاد پیش کی کہ ''شیخ الحدیث علامہ عبیداللہ مبارکپوری نے ڈاکٹر صاحب کے فتوؤں اور جوابوں پر اطمینان کا اظہار کیا تھا''، محمدی صاحب

نے یہ بھی لکھا کہ "یہ اس لیے کہ علمائے اہل حدیث شریعت کے اصل مصدر کتاب وسنت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن قدامہ کی کتاب المغنی جو ہر چیز سے غنی کرنے والی کتاب ہے، ان کے سامنے برابر موجود رہتی تھی"۔ یہاں عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس معاملہ میں علمائے اہل حدیث کی طرح دوسرے اور علماء کا بھی یہی عمل بلکہ دستور ہے۔ فرق اگر ہے تو نظر ونظریہ کا ہے، مثلاً پوتے کے حق وراثت پر فقہاء کا فیصلہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ قرآن، حدیث، اجماع اور تعامل امت پر مبنی ہے اور صرف اہل حدیث ہی نہیں دوسرے مسالک کا اسی پر عمل ہے۔ باقی عقائد کے باب میں رسوم و رواج کے متعلق فاضل فتویٰ نگار کی رایوں سے بھی دوسروں کا اختلاف کم ہی ہے۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جوابات میں اصل مصادر کے حوالوں کے باوجود زبان بہت آسان ہے، رسم گل پوشی، تقریبات میں خاموش کھڑے ہونے، قومی جھنڈا نصب کرتے وقت پھول چڑھانے، اس کو سلامی دینے، گنپتی کی آرتی اتارنے، عیسوی سال نو کا جشن منانے، دیوالی کی مٹھائی، درگا پوجا کا چندہ، غیر شرعی چندہ میں سود کی رقم کا استعمال جیسے مسائل کے جواب میں وہی حکمت و دانائی ہے جو کسی بھی کامیاب مفتی کی شناخت بن جاتی ہے۔ کتاب کا نام "نعمۃ المنان مجموع فتاوی فضیلۃ الدکتور فضل الرحمٰن" قدیم فرنگی محل کی یاد تازہ کردیتا ہے۔

تفہیم تصوف: از جناب حسین الحق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۶۶، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتے متعدد ہیں جیسے شب خون کتاب گھر، ۲۹ سی، ہیسٹنگس روڈ، الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۱۔ پرویز بک ڈپو، سبزی باغ، پٹنہ-۴۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، پرنسیس بلڈنگ، ای-آر روڈ ممبئی۔ دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ سرفہرست پتہ ہے: سرسید کالونی، نیو کریم گنج، روڈ نمبر-۶، گیا، بہار ۸۲۳۰۰۱۔

اردو کے اسلامی ادب میں غالباً سب سے زیادہ اور سب سے گراں حصہ تصوف ہی کا ہے۔ گراں، قدر کے لحاظ سے بھی اور رد کے اعتبار سے بھی، زیر نظر کتاب اسی ذخیرہ میں شامل ہے۔ مصنف کا جذبہ تصوف ان کے انتساب سے عیاں ہے جو خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام ہے۔ اس میں کہا گیا کہ "جن کے بغیر جینا ناممکن ہے" اور یہ بھی کہ "حضرت جی، سلطان جی! بہت کٹھن ہے ڈگر

پنگھٹ کی''۔ اس ڈگر کی تعبیریں ہوتی رہیں گی، لیکن اس کتاب کے بنیادی موضوع کے لیے یہ لفظ بآسانی استعمال کیا جاسکتا ہے، یہ پہلے ہی واضح کردیا گیا کہ ایک طبقہ وہ ہے جو تصوف کو غیر قرآنی اصطلاح اور صوفی کو غیر اسلامی اقدار وافعال کا حامل قرار دیتا ہے اس طبقہ سے تفہیم حدیث کا لینا دینا نہیں، مخاطب تو وہ بھی نہیں جو صحو وسکر مست، حال وقال مست والے شاہ صاحبان ہیں گفتگو تو ان سے ہے، جن کا انداز ایسا معصومانہ ہے کہ ان کی حمایت ومخالفت کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہو پاتا۔ مصنف کے انداز افہام میں قطعیت ہے وہ صاف کہتے ہیں کہ اسلامی تصوف کی اصطلاح ہی درست نہیں، سچ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سارا کا سارا تصوف اسلامی وقرآنی ہے، ان کے اسی قطعی انداز نظر نے ان کے قلم سے قریب چالیس مضامین لکھوا دیے۔ اس مجموعہ میں ان میں سے کچھ کے علاوہ چند اور غیر مطبوعہ تحریریں بھی آگئی ہیں، دیکھا جائے تو یہ مضامین زیادہ تر ردو جواب کی شکل میں ہیں، تصوف کا عجمی رویہ ہو یا اس پر عجمیت کا الزام ہو، فلسفہ سے اس کا تاثر ہو، تعقل سے اس کا استفادہ ہو، مذہب اور تہذیب سے اس کا رشتہ ہو، رہبانیت اور شعر سے ربط ہو یا پھر محض تعصب کی کارفرمائی ہو سب کا جائزہ ہے۔ سب میں تصوف کا دفاع ہے اور آخری بات یہی ہے کہ ہزار رستے ہیں اہل دل کے، معاملہ مصنف کے نزدیک صرف اتنا ہے کہ تصوف نے اسلام سے پہلے بھی اور اسلام کے بعد بھی خلق خدا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، صوفی وہی جو منشائے الٰہی اور منشائے نبوت کو اپنی اجتہادی والہامی صلاحیت کے ذریعہ، عصری ضرورتوں کے پیش نظر، جغرافیائی پس منظر میں ایسے عملی نمونے پیش کرے جو خدا اور اس کی کائنات دونوں کے لیے قابل قبول ہونے کی خوبی رکھتے ہوں۔ مصنف کی تحریر کی قطعیت اپنی جگہ لیکن ان کا حرف اعتدال بھی خوب ہے کہ جو لکھا گیا وہ حرف آخر نہیں بلکہ یہ بہرحال مبتدیانہ کوشش ہے، لکھنے کا جواز صرف یہ ہے کہ

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ، ہوا چل رہی ہے

یقیناً کتاب دلچسپ ہونے کے ساتھ بصیرت افروز بھی ہے، البتہ لفظ ''صوفیا'' بجائے ''صوفیہ'' کے محل نظر ہے، عربی عبارتوں میں مزید توجہ کی ضرورت ہے، شروع میں مخرج القلم کے عنوان سے عربی عبارت ہے جس میں پہلی سطر ہی میں خص کو خصی لکھا گیا ہے، آگے کی سطروں

میں بھی یہی حال ہے۔

اسلام اور مسلمان، کچھ سوالات، کچھ اشکالات: از پروفیسر اختر الواسع، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، این۔I، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵۔

کتاب اور اس کے مصنف کے نام سے پہلی نظر میں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دور حاضر کے سب سے بڑے موضوع یعنی اسلام اور مسلمان کے متعلق مفکرانہ و مصلحانہ بحث کا سامنا ہوگا۔ فاضل مصنف مسلمانوں خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ مسائل و مشکلات سے باخبر ہیں، ان کی نظر بھی گہری ہے، عملاً حصول تعلیم سے بلند تعلیمی مدارج تک بہت سے مرحلے ایسے آئے جن سے وہ سلیقہ اور سوجھ بوجھ سے کامیاب گزرے، لیکن بڑی خوش گوار حیرت اس کتاب کے مشمولات سے ہوئی، جن میں مذہبی، سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی کے علاوہ متفرق سوالات کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا، گویا یہ ایک نئی قسم کی کتاب الفتاوی بھی ہے، مذہبی سوالوں میں پہلا سوال قربانی کے متعلق ہے تو دوسرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے تعلق سے ہے، ساتواں سوال وجد کے بارے میں ہے، جواب میں کہا گیا کہ کسی سنگیت یا دوسری کسی بات پر جذبات سے مغلوب ہو کر جھومنا، احساس کا ایک اظہار ہے، بہت سے صوفی اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملتے ہیں، قریب ۲۵۶ سوالوں کے جواب اسی طرح عام فہم، مختصر اور مطمئن کرنے والے ہیں، جہاں ذرا پیچیدگی آئی وہاں صاف کہہ دیا گیا کہ علماء اور مفتی حضرات سے پوچھ لیا جائے، دوسرے حصہ میں سماجی سوالات کا عنوان ہے لیکن تبلیغی جماعت کے کام یا جھینگا مچھلی یا کیکڑا کھانے کے جواز اور ایسے بہت سے سوالات بھی ہیں جو مذہبی ہونے کے دائرے میں آتے ہیں، اسی طرح سیاسی، معاشی اور تعلیمی سوالات ہیں اور جس معیار کے ہیں جواب میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی کوششیں، عموماً عام قارئین کے لیے فائدہ مند ہی ہوتی ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ معروف روزنامہ راشٹریہ سہارا میں یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اب اسی کو کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

آثار قلم: مولانا زبیر احمد ندیمی ملی، مفتی سید عثمان ملی رحمانی، دار العلوم محمودیہ، جنتور ضلع پربھنی۔ قیمت =/۵۰ روپے

آقائے مدینہ ؐ (نعتیہ دیوان): گہر اعظمی، ۲۱ ڈی اسٹریٹ، فیز ۵ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

بالغ نظر نثر نگار (شرف الدین ساحل): شبانہ پروین، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور مہاراشٹر۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

تمثیل نو ادبی صحافت کا نقش: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔۴۔ قیمت =/۴۰۰ روپے

خلفائے راشدین ؓ (منظوم): گہر اعظمی، ۲۱ ڈی اسٹریٹ آف چناباں تنظیم، فیز ۵ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی۔ قیمت =/۵۵۰ روپے

روح سیاست: محمد مظہر اعظمی، مکتبہ نعیمیہ، حالات کمپلیکس، صدر بازار مئوناتھ بھنجن۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

سپیاں (افسانوی مجموعہ): ایم اے احد، ۳۷ ستیہ نگر، بھوبنیشور۔ قیمت =/۱۷۵ روپے

سہیل عظیم آبادی بنام مناظر عاشق ہرگانوی: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔ قیمت =/۱۵۰ روپے

عہد نبوی ؐ میں خواتین کا دعوتی کردار: ڈاکٹر سلیمان بن حمد العودہ، مترجم ڈاکٹر محمود حافظ عبد الرب مرزا، شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد۔ قیمت =/۲۰۰ روپے

نقوش فکر و عمل: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، الحسنات بک ڈپو، دہلی۔ قیمت =/۱۰۰ روپے

میں بھی یہی حال ہے۔

اسلام اور مسلمان، کچھ سوالات، کچھ اشکالات: از پروفیسر اختر الواسع، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، این۔I، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۲۵۔

کتاب اور اس کے مصنف کے نام سے پہلی نظر میں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دور حاضر کے سب سے بڑے موضوع یعنی اسلام اور مسلمان کے متعلق مفکرانہ ومصلحانہ بحث کا سامنا ہوگا۔ فاضل مصنف مسلمانوں خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے موجودہ مسائل ومشکلات سے باخبر ہیں، ان کی نظر بھی گہری ہے، عملاً حصول تعلیم سے بلند تعلیمی مدارج تک بہت سے مرحلے ایسے آئے جن سے وہ سلیقہ اور سوجھ بوجھ سے کامیاب گزرے، لیکن بڑی خوش گوار حیرت اس کتاب کے مشمولات سے ہوئی، جن میں مذہبی، سماجی، سیاسی، معاشی، تعلیمی کے علاوہ متفرق سوالات کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا، گویا یہ ایک نئی قسم کی کتاب الفتاوی بھی ہے، مذہبی سوالوں میں پہلا سوال قربانی کے متعلق ہے تو دوسرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے تعلق سے ہے، ساتواں سوال وجد کے بارے میں ہے، جواب میں کہا گیا کہ کسی سنگیت یا دوسری کسی بات پر جذبات سے مغلوب ہو کر جھومنا، احساس کا ایک اظہار ہے، بہت سے صوفی اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملتے ہیں، قریب ۲۵۶ سوالوں کے جواب اسی طرح عام فہم، مختصر اور مطمئن کرنے والے ہیں، جہاں ذرا پیچیدگی آئی وہاں صاف کہہ دیا گیا کہ علماء اور مفتی حضرات سے پوچھ لیا جائے، دوسرے حصہ میں سماجی سوالات کا عنوان ہے لیکن تبلیغی جماعت کے کام یا جھینگا مچھلی یا کیکڑا کھانے کے جواز اور ایسے بہت سے سوالات بھی ہیں جو مذہبی ہونے کے دائرے میں آتے ہیں، اسی طرح سیاسی، معاشی اور تعلیمی سوالات ہیں اور جس معیار کے ہیں جواب میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس قسم کی کوششیں، عموماً عام قارئین کے لیے فائدہ مند ہی ہوتی ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ معروف روزنامہ راشٹریہ سہارا میں یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اب اسی کو کتاب میں یکجا کردیا گیا ہے۔

ع۔ص

رسید کتب موصولہ

آثار قلم: مولانا زبیر احمد ندیمی ملی، مفتی سید عثمان ملی رحمانی، دار العلوم محمودیہ، جنتور ضلع پربھنی۔
قیمت =/۵۰ روپے

آقائے مدینہ ﷺ (نعتیہ دیوان): گہر اعظمی، ۲۱ ڈی اسٹریٹ، فیز ۵ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی۔
قیمت =/۲۵۰ روپے

بالغ نظر نثر نگار (شرف الدین ساحل): شبانہ پروین، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور مہاراشٹر۔
قیمت =/۲۰۰ روپے

تمثیل نو ادبی صحافت کا نقش: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔۴۔
قیمت =/۴۰۰ روپے

خلفائے راشدین ؓ (منظوم): گہر اعظمی، ۲۱ ڈی اسٹریٹ آف چناباں تنظیم، فیز ۵ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی۔
قیمت =/۵۵۰ روپے

روح سیاست: محمد مظہر اعظمی، مکتبہ نعیمیہ، حالات کمپلیکس، صدر بازار مئوناتھ بھنجن۔
قیمت =/۲۰۰ روپے

سیپیاں (افسانوی مجموعہ): ایم اے احد، ۳۷ ستیہ نگر، بھوبنیشور۔
قیمت =/۱۷۵ روپے

سہیل عظیم آبادی بنام مناظر عاشق ہرگانوی: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔
قیمت =/۱۵۰ روپے

عہد نبوی ﷺ میں خواتین کا دعوتی کردار: ڈاکٹر سلیمان بن حمد العودہ، مترجم ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا، شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد۔
قیمت =/۲۰۰ روپے

نقوش فکر و عمل: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی، الحسنات بک ڈپو، دہلی۔
قیمت =/۱۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		150/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
January 2018 Vol - 201 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

شبلی صدی مطبوعات

۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	شذرات سرسید	پروفیسر اصغر عباس	500/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۹۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۲۰۔	الندوہ (جلد ۱۔۴)		2175/-
۲۱۔	الندوہ (جلد ۵۔۹)		زیر طبع

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر		100/-
سفر نامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	//	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	//	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	//	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	//	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	//	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	//	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	//	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبد السلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	//	150/-
مکاتیب شبلی دوم	//	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		150/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
January 2018 Vol - 201 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

شبلی صدی مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	2000/-
۲۔	شبلی کی آپ بیتی	ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
۳۔	دارالمصنّفین کے سو سال	کلیم صفات اصلاحی	350/-
۴۔	شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-
۵۔	شذرات سرسید	پروفیسر اصغر عباس	500/-
۶۔	محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس	ڈاکٹر جاوید علی خاں	230/-
۷۔	حیات شبلی	علامہ سید سلیمان ندوی	650/-
۸۔	مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	اشتیاق احمد ظلی	250/-
۹۔	حیات سعدی	تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
۱۰۔	شبلی شناسی کے اولین نقوش	مرتبہ: ظفر احمد صدیقی	600/-
۱۱۔	شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
۱۲۔	متاع رفتگاں	شاہ معین الدین احمد ندوی	200/-
۱۳۔	یہود اور قرآن مجید	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
۱۴۔	رسائل شبلی	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۱۵۔	اردو ترجمہ مکاتیب شبلی	ڈاکٹر خالد ندیم	110/-
۱۶۔	تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی)	مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	300/-
۱۷۔	مراسلات شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	150/-
۱۸۔	مطالعات شبلی	مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی	550/-
۱۹۔	الفاروق (ہندی)	علامہ شبلی نعمانی	300/-
۲۰۔	الندوہ (جلد ۱۔۴)		2175/-
۲۱۔	الندوہ (جلد ۵۔۹)		زیر طبع